بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

علم وفن اور زبان وادب کی خدمت واشاعت کا ایک اہم ذریعہ نقل وترجمہ ہے، ترجمہ کے ذریعے کسی زبان کی تصنیف یا تخلیق، اس زبان کے مصنفین یا ارباب قلم کے نتائج فکر ومطالعہ اور قلمی کاوشوں کو دوسری زبان میں منتقل کر کے ان سے روشناس اور واقف کرایا جاتا ہے، ان کا دائرہ وسیع کر کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ان کے مطالعہ اور ان سے استفادہ کا موقع فراہم کیا جاتا ہے۔ یہ کام اہم ہے اور نسبۃً مشکل بھی۔ متعدد مسلمان حکمرانوں نے اس فن پر توجہ صرف کر کے بڑے پیمانے پر ترجمہ کے کام کرائے، اور اس کے لیے باقاعدہ ادارے اور شعبے قائم کیے۔ اس سلسلے میں مشہور عباسی فرماں روا اور علم دوست ومعارف پرور بادشاہ مامون کا نام سرفہرست ہے۔ اس نے بڑے بڑے اہل علم ودانش اور تالیف وترجمہ کے ماہرین کی خدمات حاصل کر کے دوسری زبانوں کی بے شمار اہم کتابوں اور شاہکار تصنیفات کو عربی زبان میں منتقل کرا کے ان کو عربوں اور عربی دانوں میں رائج اور عام کیا۔ آج کتنی کتابیں ایسی ہیں جو اپنی اصلی زبانوں میں موجود نہیں، جن زبانوں میں وہ لکھی گئیں ان میں وہ ناپید ہیں، مگر عربی میں منتقل ہونے کے بعد آج تک اہل علم کے کام آ رہی ہیں۔ اس طرح ترجمہ کا فن اور اس کا کام دوسری زبانوں کی تخلیقات سے آگاہی، ان کی توسیع اور نشر واشاعت، علم کی خدمت اور اس کے تحفظ وبقا کا بہترین اور مؤثر ذریعہ ہے۔

ادارہ المآثر نے تخلیقی وتحقیقی مضامین ومقالات کی اشاعت کے ساتھ ساتھ، عربی زبان کے اہم اور بیش قیمت علمی وفکری وتحقیقی مقالات وتصنیفات کو اردو کے قالب میں ڈھال کر دل دادگان علم ومعرفت کی خدمت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اور عربی زبان میں علم وتحقیق کا جو سرمایہ ہے اس سے انتخاب کر کے اردو داں طبقے تک پہنچانے کو اپنی علمی وقلمی خدمت کا ایک اہم حصہ قرار دیا ہے۔ یہ

رسالہ اپنی عمر کے تقریباً پچیس سال کا سفر طے کر چکا ہے، اس دوران اس کے صفحات پر متعدد بیش قیمت مضامین اور کئی اہم اور قابل قدر تصانیف ترجمہ کے مراحل سے گزرنے کے بعد علم ومعرفت کے قدردانوں کی خدمت میں پیش کی جا چکی ہیں۔

بہت پہلے مصر کے معروف محقق عالم شیخ محبّ الدین خطیب مصری کا ایک مختصر سا رسالہ نظر سے گزرا تھا،اس رسالے کا نام ہے **الخطوط العريضة للأسس التي قام عليها دين الشيعة الإمامية الإثنى عشرية.** جس کا اردو ترجمہ ''اثنا عشری امامی مذہب کے خدوخال'' کے عنوان سے نذر قارئین ہے۔

اس رسالے کو دیکھتے ہی اس کو اردو میں منتقل کرنے کا داعیہ پیدا ہوا تھا،اس میں جس اختصار کے ساتھ شیعوں کے عقائد اور ان کی مذہبی تعلیمات کی پردہ دری کرتے ہوئے واشگاف کیا گیا ہے، وہ بہت مفید، لائق مطالعہ اور اس قابل ہے کہ اس سے ہر مسلمان کو روشناس کرایا جائے۔اور اس طرح شیعوں کے عقائد ونظریات، مذہبی تعلیمات اور اسلام کو نقصان پہنچانے کی درپردہ سازشوں اور مذموم کوششوں سے ہر شخص کو واقفیت اور بصیرت حاصل ہو جائے۔

مدینہ منورہ اور اس کی تاریخ ہر کلمہ گو کے لیے کیف وسرور کا باعث ہوتی ہے،اور قلب ودماغ کی غذا اور تقویت کا کام کرتی ہے، متعدد اہل علم، اصحاب تصنیف وتالیف اور ارباب سیر وتاریخ نے مدینہ منورہ کی تاریخ پر اپنے قلم کی جولانی دکھائی ہے۔ان تاریخی کتابوں میں آٹھویں صدی ہجری کے علامہ مطری کی کتاب **التعريف بما أنست الهجرة من معالم دار الهجرة** ہے۔

اس کتاب کو اردو کا جامہ پہنا کر شائقین علم ومطالعہ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جا رہی ہے۔امید ہے یہ کتاب قارئین المآثر کے لیے پسند خاطر ہوگی۔

تفسیر سورۂ مطفّفین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''علیین'' کے لفظ کی تحقیق اور اس کو جمع اور سجین کو مفرد لانے میں نکتہ:

''علیین'' علو سے مشتق، علیّ بروزن فعیل کی جمع اور سجین کے ہم وزن ہے، علیین نیک لوگوں کی ارواح کے مقام کا نام ہے، اس کو جمع اس لیے لائے تا کہ اس مقام کی وسعت وکشادگی پر دلالت کرے، معنی کے لحاظ سے اگر چہ یہ مفرد ہے مگر لفظوں میں جمع کی صورت پر ہے کہ اشارہ اس مقام کی وسعت کی طرف ہے (جیسے کسی ایک آدمی کی قوت وسعت کی زیادتی بتانے کے لیے کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ تو پوری جماعت ہے یا قوم ہے وغیرہ) اس لیے اس کا اعراب جمع مذکر سالم والا ہوتا ہے۔

سجّین کو مفرد اور علیین کو جمع لانے میں یہی نکتہ ہے کہ سجّین کے معنی میں (یعنی اس مقام میں جس کا نام سجین ہے) تنگی، گھٹن اور ازدحام ہے، اس لیے لفظوں میں بھی اس کو مفرد لائے، چونکہ ایک مکان کے اندر اگر جم غفیر داخل ہو جائے تو اس میں تنگی اور ازدحام پیدا ہو جائے گا، اور علیین کے معنی میں (یعنی اس مقام میں جس کا نام علیین ہے) وسعت، فراخی اور کشادگی ہے اس لیے لفظوں میں بھی اس کو جمع لائے، گویا یوں ارشاد ہوا کہ نیک لوگوں کی ارواح میں سے ہر ایک روح ایک بہت بلند وبالا اور وسیع مکان میں ہے (یعنی علیین کو جمع لا کر اس کی وسعت وکشادگی کی طرف اشارہ کیا کہ وہ اتنی وسیع وعریض جگہ ہے کہ ارواح کے اجتماع سے وہاں تنگی یا ازدحام پیدا نہیں ہوتا، بلکہ ہر روح کے لیے اتنی وسیع جگہ ہے جو بہت وسیع ہے، گویا وہ ایک مقام ایک نہیں کئی مقامات پر مشتمل ہے۔ واللہ اعلم)

یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ مکان جتنا بلند ہوگا وہ لازماً اتنا ہی وسیع وفراخ بھی ہوگا، لہٰذا سجین اور علیین کے درمیان لغوی معنی کے لحاظ سے بھی تقابل درست ہوا، اس لیے کہ دونوں کے درمیان تقابل بالعرض متحقق ہو گیا (یعنی سجن لغوی لحاظ سے پستی اور علو بلندی کے معنی میں آتا ہے)

علیین کا محلِ وقوع:

علیین ساتوں آسمان کے اوپر واقع ہے، اس کا نچلا سرا سدرۃ المنتہیٰ کے پاس ہے اور اوپر کا سرا

عرشِ مجید کے دائیں پائے کے متصل ہے، نیک لوگوں کی ارواح قبض کرنے کے بعد وہیں لے جائی جاتی ہیں، اور ان کے اعمال نامے وہاں پہنچانے اور ان کے نام وہاں درج کر لینے کے بعد اپنے اپنے درجات کے مطابق ان کو مختلف مقامات میں رکھا جاتا ہے، مقربین یعنی انبیاء واولیاء تو وہیں رہتے ہیں، عام صلحاء میں سے بعض کو آسمانِ دنیا میں کسی کو زمین وآسمان کے درمیان اور کسی کو زمزم کے کنویں میں رکھا جاتا ہے۔

ارواح کا اپنی قبور سے تعلق ہوتا ہے:

اوران ارواح کا اپنی قبر سے بھی ایک تعلق ہوتا ہے، چنانچہ قبر پر آنے والے لوگوں اور دوست و اقرباء کی ان کو اطلاع ہوجاتی ہے اس لیے کہ روح کو اطلاع حاصل کرنے میں مقام اور جگہ کے قریب یا دور ہونے سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی، اس کی مثال انسان کے وجود میں روحِ بصری (یعنی نگاہ) ہے کہ ساتوں آسمانوں کے ستاروں کو کنویں کے اندر سے دیکھ سکتی ہے (اسی طرح روح کو سمجھ لیں)

جب مقام علیین ایسا ہے کہ اس تک انسانی عقل کی رسائی نہیں ہوسکتی جب تک خود باری تعالیٰ نہ بتادیں، تو اس لیے اس کی تفسیر سوال وجواب کے انداز میں ارشاد فرماتے ہیں:

وَمَآ اَدْرٰکَ مَا عِلِّیُّوْنَ ۝ کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝

اور تجھ کو کیا خبر ہے کیا ہے علیین، ایک دفتر ہے لکھا ہوا

یعنی وہ لکھا ہوا اور علامت لگایا ہوا دفتر ہے کہ اس علامت کو دیکھتے ہی ہر شخص پہچان لے کہ یہ شخص جنتی ہے (علامت کی تفصیل پیچھے سجین کے تحت گذر چکی ہے)

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (وہ دفتر) ایک زمرد کی سبز کھدی ہوئی تختی ہے جو عرشِ معلیٰ کے دائیں پائے سے لٹک رہی ہے، اس کا پائین سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچا ہوا ہے، اور وہ دفتر اللہ کے خاص بندوں کے حوالے ہے، چنانچہ فرمایا:

یَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝

اس کو دیکھتے ہیں نزدیک والے یعنی فرشتے

یعنی اس دفتر کے پاس مقرب فرشتے موجود رہتے ہیں جو حاملانِ عرش اور خادمانِ کرسی ہیں۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''مقربون'' سے مراد یہ ہو کہ اس عالیشان مقام میں اہلِ کمال کی ارواح قیام پذیر ہیں، جیسے انبیاء علیہم السلام واولیاء کرام ہیں۔ اور ''ابرار'' کے لیے یہی فخر کافی ہے کہ اس مقدس مقام میں ان کے نام درج ہیں اور اعمال نامے ہیں۔

مقربین وسابقین، ابرار واصحاب الیمین میں فرق:

یہاں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ''اہلِ نجات'' کو قرآن میں کئی سورتوں کے اندر دو قسموں میں بیان فرمایا ہے۔

۱:- کبھی مقربین وسابقین کے نام سے ان کو ذکر کیا ہے۔

۲:- اور کبھی اصحاب الیمین وابرار، ان کو کہا ہے۔

ان دونوں قسموں کی تحقیقِ حقیقت میں محققین کا اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ ''سابقین ومقربین'' سے مراد اصحابِ محبتِ ذاتیہ ہیں، یعنی وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ سے صرف اس کی ذات کی وجہ سے محبت کرتے ہیں، اور ''ابرار واصحاب الیمین'' وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے محبت انعام کی توقع پر کرتے ہیں۔

اسی قول کے قریب یہ قول بھی ہے کہ ''مقربین وسابقین'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو فنا فی اللہ، اور بقا باللہ کے مقام کو پہنچ گئے ہیں اور ''ابرار واصحاب الیمین'' سے وہ لوگ مراد ہیں جو اذکار وطاعات کے انوار سے منور ہو چکے ہیں اور انشراحِ صدر پیدا کرلیا، لیکن ہنوز بقا وفنا کا مرتبہ حاصل نہیں کر سکے۔

بعض کہتے ہیں کہ ہر نیک عمل کی دو حدیں ہیں۔ ایک حد فوقانی ہے (اوپر کی) اور دوسری حد ہے تحتانی (نیچے کی) پس جس آدمی نے کوئی نیک عمل انتہائی صدق واخلاص کے ساتھ اس عمل کی تمام شرائط، سنن وآداب کی مکمل رعایت کرتے ہوئے اس طرح پابندی کے ساتھ کیا کہ اس عمل کے ثواب وثمرات کو ضائع ہونے سے بچائے رکھا اور ان ساری باتوں کی رعایت اس درجے کی کہ حدِ فوقانی تک پہنچ گیا تو وہ شخص ''مقربین'' میں ہے (اس عمل کے اعتبار سے) اور جس نے ان ساری باتوں کی رعایت پہلے کی بنسبت کم درجے میں کی تو وہ ''ابرار'' میں ہے (اس عمل کے اعتبار سے)

اس تقریر کے مطابق ایک ہی آدمی بعض اعمال کے اعتبار سے مقربین کے مرتبے کا اور بعض اعمال کے اعتبار سے ابرار کے مرتبے کا ہوسکتا ہے، ایک شخص میں یہ دونوں مراتب جمع ہوسکتے ہیں۔

حضرت مصنف علام کی تحقیق:

اور وہ بات جو مقربین، سابقین، ابرار اور اصحاب الیمین کے الفاظ سے، اور قرآن کی اس ترتیب ونسق سے جو اللہ تعالیٰ نے ان دو گروہوں کی صفات بیان کرتے ہوئے اختیار فرمائی ہے اس سے سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ابرار واصحاب الیمین ایسی جماعت ہے جو حقوق اللہ، حقوق العباد ادا کرتی ہے، مخلوق کے ساتھ احسان کرتی اور جملہ نیک اعمال کے انجام دینے میں جد وجہد کرتی ہے، اور ان سارے اعمال میں اس نے اس درجہ کوشش کی کہ انھوں نے اپنی قوتِ ملکیہ کو اپنی قوتِ بہیمیہ وسبعیہ پر غالب کرلیا[1]۔

اور ''مقربین وسابقین'' وہ جماعت ہے کہ ان اعمال وصفات کے ساتھ ساتھ جذبِ الٰہی کے طریق پر ان کے باطنی پردے اٹھ گئے، کامل شہود وحضوری نصیب ہوگئی، ان کا سلوک جذب کے طریق پر منتہی ہوگیا اور اپنے محبوب سے انھوں نے قربِ حقیقی حاصل کرلیا، واللہ اعلم۔

بعض عارفین کی نظر میں ''علیین'' و''سجین'' کے مقام کی تحقیق:

علیین وسجین کی تصویر بعض عرفاء نے یوں کھینچی ہے کہ نوعِ انسانی کا کام، معرفت کی وسعت وتنگی کے اعتبار سے، اور لطائف کی تہذیب وتکدر، انوارِ ملکیہ کی تحصیل یا ظلماتِ بہیمیہ وسبعیہ کے لحوق کے اعتبار سے ایک عرض عریض ہے، یا یوں کہہ لیجئے کہ ایک وسیع میدان ہے، اس قدر وسعت وکشائش کسی اور نوع میں ممکن نہیں چنانچہ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

و لم أر أمثال الرجال تفاوتا

لدى الفخر حتى عد الف بواحد

اس وسیع میدان کو ایک خیالی دائرہ فرض کرنا چاہئے، اس دائرے کا مرکز انسانیت کا ادنیٰ مرتبہ ہے جو انتہائی گھٹیا اور فروتر مرتبہ ہے اور دائرے کا محیط انسانیت کا اعلیٰ مرتبہ ہے۔

جب اس خیالی شکل نے عالم غیب میں صورتِ مثالی اختیار کی تو اس کا محیط علیین کے نام سے

---

(۱) قوتِ ملکیہ سے مراد انسان کے اندر رکھی گئی وہ قوت ہے جو نورانی اعمال سے بڑھتی رہتی ہے جس شخص میں یہ قوت جتنی زیادہ ہوگی اس کو فرشتوں اور عالم ملکوت کے ساتھ اتنی زیادہ مناسبت ہوگی۔

قوتِ بہیمیہ سے مراد وہ قوت ہے جو حیوانی خواہشات کا تقاضا کرتی ہے مثلاً پیٹ کی اور جنسی خواہشات وغیرہ۔

قوتِ سبعیہ سے مراد غضب وغصہ کی قوت ہے جو حد سے بڑھ جائے تو انسان درندگی پر اتر آتا ہے۔ ۱۲ سفیر احمد

موسوم ہوا اور اس کا مرکز سجین قرار پایا۔

اور یہ ثابت ہے کہ دائرے کے اندر جو دائرے کھینچے جائیں ان میں سے جو اس بڑے دائرے کے مرکز کے جتنے قریب ہوتے جائیں گے وہ اتنے ہی درجہ بدرجہ چھوٹے اور تنگ ہوتے جائیں گے اور جو دائرے محیط کے قریب ہوتے جائیں گے وہ اتنے ہی درجہ بدرجہ وسیع ہوتے جائیں گے۔

چنانچہ ''فجار'' کی انسانیت کے مراتب درجہ بدرجہ مرکز کے قریب ہیں یہاں تک کہ بعض تو مرکز تک ہی پہنچ گئے ہیں، اور انسانیتِ ابرار کے مراتب درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے محیط کے قریب ہوتے چلے جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے ان کی وسعت بڑھتی جاتی ہے، یہاں تک کہ نوبت اعلیٰ علیین تک جا پہنچتی ہے، جو مقربین وسابقین کا مقام ہے، ابرار کو بھی مقربین کی تبعیت وپیروی میں اس مقام کا روحانی عبور عطا ہوتا ہے، مگر یہ ان کے ٹھہرنے کا مقام نہیں ہے، البتہ ابرار کی ارواح کو جسم سے جدا ہونے کے بعد اس مقام پر عبور کرایا جاتا ہے، اور اس عبور کا فائدہ واثر یہ ہے کہ ان کے نام اس مقام کے رہنے والوں کی پیروی کرنے والوں میں لکھ دیے جاتے ہیں۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ O

بیشک نیک لوگ ہیں آرام میں

جب اس بیان سے فارغ ہوئے کہ ابرار کی ارواح قبض کرنے کے بعد کیا معاملہ پیش آتا ہے، تو اب ان کے اس انجام کو بیان فرماتے ہیں جو قیامت کے دن ان کا ہوگا، فرمایا کہ نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے۔

''نعیم'' کا لفظ ان تمام چیزوں کو شامل ہے جو جنت میں ہوں گی جیسے حور، قصور، کھانا پینا، پہننا، سواریاں، خوبصورت خادم اور مکانات وغیرہ جو کچھ وہاں تیار کیا گیا ہے، اس کے علاوہ جنت کی ایک نعمت یہ بھی ہے کہ جنتی سونے کا جڑاؤ کیے ہوئے تختوں پر بٹھائے جائیں گے، ان تختوں پر موتیوں کے قبے قائم کیے جائیں گے، ان قبوں کے اندر جنتی بیٹھیں گے، اس طرح کہ وہ سب کچھ دیکھیں گے مگر وہ دکھائی نہیں دیں گے، چنانچہ فرماتے ہیں:

عَلَى الْاَرَائِكِ يَنْظُرُوْنَ ۝

تختوں پر بیٹھے دیکھتے ہوں گے

یعنی نیک لوگ سایہ دار تختوں پر بیٹھے دیکھتے ہوں گے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤمن کو جنت کی تمام نعمتوں سے لطف اندوز ہونا نصیب فرمائیں گے، اس کے مقابلے میں دنیا کے اندر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو نعمتوں سے تو نوازتے ہیں مگر ان سے لطف اندوز ہونا ان کو نصیب نہیں ہوتا، جیسے کوئی بادشاہ بیمار ہو یا ضعیف الباہ ہو تو لذیذ کھانوں اور حسین عورتوں سے کچھ کیف وسرور اٹھا نہیں سکتا۔

یہ بھی حدیث میں آتا ہے کہ سب سے کم درجے کے جنتی کو اس دنیا جتنی جگہ نعمتوں سے لبریز ملے گی۔

"ینظرون" کے مفعول کو حذف کرنے کی وجہ:

"ینظرون" کے مفعول کو تعمیم کے لیے حذف کر دیا ہے (یعنی مفعول ذکر کر کے منظور الیہ کو مخصوص نہیں کیا) تاکہ دیکھنے میں عموم پیدا ہو کہ وہ سب کچھ دیکھیں گے، حوریں، محلات، نہریں، باغات اور بہشت کی دیگر نعمتیں اور کفار کے عذاب کو بھی یہ دیکھنا شامل ہو، مقصد یہ ہے کہ یہ سایہ دار تخت ان کو جنت کی سیر اور جہنم کو دیکھنے میں رکاوٹ نہیں بنیں گے۔ بخلاف دنیا کے تختوں کے کہ وہ بیٹھنے والوں کو سیر و نظارہ کرنے سے رکاوٹ بنتے ہیں۔

اُرائک کی لغوی تحقیق:

اُرائک، اریکہ کی جمع ہے لغت میں اریکہ اس تخت کو کہتے ہیں جس پر سائبان کی طرح قبہ بنا ہوا ہو جو رنگین پردوں، مزیّن جھالروں سے آراستہ ہو، اس کو ہندی زبان میں چھپر کھٹ کہتے ہیں۔

اُرائک کی تفسیر میں عارفین کا قول:

ارائک جو جنت میں ابرار کو نصیب ہوں گے اور ان کا ذکر قرآن میں بھی جا بجا بہت تعریف کے ساتھ آیا ہے، عارفین نے ان کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ اسماء الٰہیہ کے مقامات کی صورت مثالیہ ہے جن میں یہ ابرار دنیا میں تھے، مگر دنیا میں ان کے یہ مقامات آنکھ اور عقل سے پوشیدہ تھے، مگر یہ ابرار ان مقامات میں ٹھہر کر وہاں سے "وجود" کے سارے مراتب کی سیر کیا کرتے تھے۔

تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِO

پہچان لے تو اُن کے منھ پر تازگی آرام کی

یعنی اے دیکھنے والے تو ان کے چہرے پر نعمتوں کی تازگی دیکھ لے گا، کہ دوزخیوں کا برا حال دیکھ کر ملال یا غبارِ خاطر نہ ہوگا کہ جس کا تغیر چہرے پر ظاہر ہو بلکہ دشمنوں کا عذاب میں مبتلا دیکھنا تو مزید فرحت وسرور کا باعث ہوگا اسی وجہ سے خوشی وسرور کے آثار ان کے چہرے سے ٹپکتے ہوں گے۔

يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍO

اُن کو پلائی جاتی ہے شراب خالص مہر لگی ہوئی

یعنی ان کو خالص شراب پلائی جائے گی، اس لیے کہ یہ اللہ کی محبت کی صورتِ مثالی ہے جو شراب کی طرح ان کے دلوں، رگ وریشہ اور روح میں سرایت کرگئی تھی، وہ خالص محبت تھی اس میں نفسانیت یا معاصی کی آمیزش نہیں تھی۔

مختوم کی تفسیر:

جنت میں شراب نہروں، چشموں کی صورت میں بہہ رہی ہوگی، چنانچہ قرآن کی بہت سی سورتوں میں اس کا ذکر ہے اور یہ عام استعمال ہوگی، ہر خاص وعام اس میں ہاتھ ڈالے گا، اس لیے اس عام استعمال میں آنے والی شراب سے احتراز کرنے کے لیے ابرار کے لیے مخصوص کردہ شراب کی ایک اور قید ذکر فرمائی ہے یعنی ''مختوم'' کہ وہ خالص شراب مہر (سیل) کی ہوئی ہے، یہ دوسری شرابوں سے ممتاز اور جدا ہے۔

اور یہ خالص شراب جو محبت الٰہیہ کی صورتِ مثالی ہے اس کے سیل مہر کرنے میں راز یہ ہے کہ یہ محبت باوجود انتہائی جوش و ہیجان ہونے اور عشق کے مرتبے سے بھی کوسوں آگے بڑھ جانے کے شریعت کی مہر سے مہر کی گئی تھی، شریعت سے تجاوز نہیں کرتی تھی، احکامِ الٰہی کی مہر کے نیچے محفوظ تھی، اور اس محبت کے ساتھ حرام محبت، شہواتِ نفسانیہ ممنوعہ، اور نجاسات شیطانیہ کی ہرگز آمیزش نہیں تھی (گویا یہ مہر احکام شریعت سے عدم تجاوز کی صورتِ مثالی ہوگی)

خِتٰمُهٗ مِسْكٌO

جس کی مہر جمتی ہے مشک پر

دنیا کی شرابوں کو جس شیشی، بوتل میں ڈالا جاتا ہے اس میں بھی حفاظت اور احتیاط کے پیش نظر مہر کی جاتی ہے، مگر وہ سیل مہر یا مٹی کی ہوتی ہے یا موم وغیرہ کی، لیکن اس شرابِ مختوم کے عجائبات میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ اس پر جس چیز کی مہر کی ہے وہ مشک ہے، تاکہ بوتل اٹھاتے ہی مشک کی خوشبو مشام جان کو معطر کردے۔

اور یہ مشک صورتِ مثالی ہے شریعت کے اس حکم کی جو ان چیزوں کی اباحت کے بارے میں وارد ہوا تھا جو چیزیں دنیا میں ان نیکوکار لوگوں کے دلوں کو تقویت دینے والی، خوش کرنے والی اور ذوق وشوق کو بڑھانے والی تھیں۔

وَ فِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ○

اور اس پر چاہئے کہ ڈھکیں ڈھکنے والے

یعنی یہ شراب جو نمونہ اور صورتِ مثالی ہے اس نفیس چیز (محبتِ الٰہیہ) کی، رغبت کرنے والوں کو اس میں رغبت کرنی چاہئے، یہ کوئی رغبت کی چیز ہے کہ مٹھی بھر جو یا گندم میں لوگوں کا حق ماریں، اس خسیس چیز کی اس سے کیا نسبت ہے؟

ختام کے معنی میں بعض مفسرین کا قول:

بعض مفسرین نے ختام کا معنی ''ختم'' اور انتہا سے کیا ہے، یعنی خالص شراب کے ختم پر مشک ہوگی، چنانچہ اس معنی کے مطابق حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنتیوں کی آخری شراب مشک ہے، اور مشک وہ شراب ہے جو چاندی کی طرح سفید ہے اور اس شراب میں ہاتھ ڈبو کر دنیا میں کوئی ظاہر کردے تو دنیا کے تمام جاندار اس کی خوشبو سے مَست ہوجائیں۔

ظاہر یہ ہے کہ وہ شرابِ خالص جنتیوں کو سب سے آخر میں پلائی جائے گی اس جہت سے اس کو مشک کا نام دیدیا گیا ہے، اس لیے کہ مشک گرم دواؤں میں سے ہے، غذا کو جلد ہضم کرتی اور منھ کو خوشبودار کرتی ہے، وہ شراب بھی جنتیوں کی محفل شراب کے ختم پر پلائی جائے گی اور اس کی بھی یہی خاصیت ہوگی۔

مصحف عثمانی کے تاریخی نسخے

ابو محفوظ الکریم معصومی رحمۃ اللہ علیہ

(تیسری قسط)

مسجد نبوی کا نسخہ:

مدینہ منورہ کے قدیم مؤرخین کی جو یادداشتیں مسجد نبوی کے مصاحف کے بارے میں علامۂ سمہودی کے سامنے تھیں، ان میں حضرت عثمان کے مصاحف میں سے کسی نسخے کا تذکرہ نہیں تھا۔

اندلسی سیاح ابن جبیر ہی کو یہ اولیت حاصل ہے کہ ۵۸۰ھ میں زیارت مدینہ سے مشرف ہوکر جو روئداد انھوں نے قلم بند کی اس میں حجرۂ مبارکہ اور مقام النبی کے درمیان مصحف عثمانی کی جگہ معین کر کے بتائی ہے[1] اور اس بات کی صراحت کی ہے کہ یہ نسخہ ان مصاحف میں سے ایک ہے جو حضرت عثمان کے زمانے میں مدینہ سے باہر بھیجے گئے تھے، مشہور مؤرخ ابن النجار[2] بغدادی (م ۶۴۳ھ) کی تاریخ مدینہ میں موقع ومحل کے اعتبار سے گویا اسی مصحف کا ذکر ملتا ہے، لیکن ابن النجار نے اس کو عہد عثمانی سے منسوب نہیں کیا۔ ابن النجار کے ذریعہ یہ نئی اطلاع ملتی ہے کہ قرآن کریم کا یہ نسخہ مسجد نبوی کے لیے مصر سے بھیجا گیا تھا۔

ابن جبیر کے بعد خطیب ابن مرزوق[3] نے اس نسخے کو مصحف عثمانی قرار دیا ہے۔ انھوں نے ۷۳۵ھ میں اسے دیکھا تھا، سرورق پر بہ قول خطیب مذکور عہد عثمانی کے مرتبین وکاتبین مصحف کے نام ان الفاظ میں درج تھے: ''هـذا ما أجمع عليه جماعة من أصحاب رسول الله ﷺ منهم زيد بن ثابت وعبدالله بن الزبير وسعيد بن العاصي ''۔ اور یہ تحریر بھی ثبت تھی: ''قال النخعي لعله الكوفي أو البصري ''۔ کاتبین مصحف کے نام یقیناً بعد میں کسی نے لکھے ہوں گے، اس لیے کہ عہد صحابہ میں بین الدفتین اس قسم کی تحریروں کے لیے کوئی گنجائش نکل نہیں سکتی تھی۔ اس تحریر سے نسخے کی تاریخی اہمیت مشکوک ہوجاتی ہے۔ دوسری تحریر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کسی شخص کو اس نسخے کی تحقیق کا داعیہ پیدا ہوا ہوگا۔

(۱) کتاب الرحلہ ص ۱۹۳: وفاء الوفا (۱: ۴۸۲)
(۲) وفاء الوفا (۱: ۴۸۱)
(۳) نفح الطیب (۱: ۲۸۳)

خطیب ابن مرزوق کے ایک معاصر [1] محمد بن احمد المطری (م ۷۴۱ھ) نے اپنی تاریخ مدینہ میں اس کا ذکر مصحف عثمانی کی حیثیت سے کیا ہے، سمہودی کے عہد تک عام طور پر مشہور تھا کہ یہی نسخہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مصحف خاص ہے۔اس کا ثبوت اسی قدر تھا کہ آیت ''فسیکفیکھم اللّٰہ'' پر خون کے نشانات تھے۔علامۂ سمہودی [2] (م ۹۱۱ھ) اس کو مصحف خاص قرار نہیں دیتے کہ اس خصوصیت کے حامل مکۂ معظّمہ اور قاہرہ میں بھی قرآن پاک کے دو قدیم نسخے ان کی نظر سے گزرے تھے، ان کی رائے میں مصحف خاص سے مشابہت پیدا کرنے کے لیے بعد میں ان نسخوں کے اندر آیت مذکورہ ''خلوق'' کے ذریعہ رنگ دی گئی ہوگی۔ ان مصاحف کے بارے میں وہ زیادہ سے زیادہ یہ تسلیم کرنے کو آمادہ نظر آتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ارسال کردہ ہوں گے۔ان نسخوں کے علاوہ مزید تین نسخے ہمارے علم میں عہد عثمانی سے منسوب تھے، ان کا تذکرہ مختصر طور پر ذیل میں کیا جاتا ہے:

۶۵۳ھ میں خلیفۂ مستعصم باللہ (م ۶۵۶ھ) کی ایک بیگم کے حکم سے مدرسۂ بشیریہ [3] کی عمارت تکمیل کو پہنچی اور اس کا افتتاح خود خلیفہ نے شہزادوں اور اعیان دولت کی جلو میں کیا تھا؛ خلیفہ کی طرف سے نادر و نایاب نسخے ۳۰۶ صندوقوں میں بھر کر اس مدرسے کے کتب خانے کے لیے عطا ہوئے۔ان میں ابن مقلہ اور ابن البواب کے نوشتہ دفاتر اور قرآن کریم کے دو نادر نسخے بھی تھے؛ ایک نسخے کی یہ خصوصیت بتائی گئی ہے کہ خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دست مبارک کا نوشتہ تھا۔

رمضان ۶۶۱ھ میں الملک الظاہر بیبرس [4] نے ملک برکہ خاں تاتاری، فرمانروائے قبچاق کو ہدایا وتحائف بھیجے تھے؛ ان کی فہرست میں ابن واصل مصنف ''مفرج الکروب فی أخبار بنی ایوب'' نے ایک مصحف کا تذکرہ کیا ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا نوشتہ تھا۔

آٹھویں صدی کے سیاح [5] ابن بطوطہ (م ۷۷۹ھ) نے بصرہ کی سیاحت میں مسجد امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ اس خزانے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مصحف خاص موجود تھا جس کے اوراق خون آلودہ تھے۔

---

(۱) وفاء الوفا (۱:۴۸۲) (۲) ایضاً (۱:۴۸۲-۴۸۳)

(۳) تحفۃ الأصحاب ورق ۳۰۸ ظ (مخطوطۂ مجمع اسیاوی کلکتہ رقم: ۴۸۹ عربی)، یہ عبارت ذہبی کی تاریخ الاسلام سے ماخوذ ہے۔

(۴) سخاوی: السلوک فی معرفۃ دول الملوک قسم ثانی (۱:۴۹۷) تحقیق: مصطفیٰ زیادہ طبع قاہرہ، ۱۹۳۶ء

(۵) تحفۃ النظار (۱:۱۱۶) طبع مصر

اس عہد کے محققین میں سے استاذ طاہر الکردی نے حجاز ومصر کے کتب خانوں میں مصحف عثمانی کی جستجو کی تھی، لیکن ان کو کامیابی نہیں ہوئی۔ مصحف مدینہ جس کا وجود دسویں صدی کے اوائل تک بہ شہادت سمہودی ثابت ہوتی ہے، اس کے بارے میں بھی طاہر الکردی نے تحقیق کرنی چاہی مگر ان کو اس سے زیادہ معلوم نہ ہوسکا کہ ۱۳۳۴ھ میں جب ترک حرمین سے بے دخل ہوئے تو غالبًا یہ نسخہ استنبول کو منتقل ہو گیا[۱]۔

علامہ کرد علی نے جامع ایا صوفیا استنبول[۲] کے ایک مصحف کی بابت اپنے دوست شیخ مسعود الکواکبی کا بیان نقل کیا ہے کہ اس کے سرورق پر ''حررّہ عثمان بن عفان'' کے الفاظ مکتوب تھے اور اس کی زیارت کا موقع ان کو کئی بار ملا تھا؛ لیکن استنبول کے علمی نوادر ومخطوطات کی نمائش جو ستمبر ۱۹۵۱ء میں مؤتمر مستشرقین کے انعقاد کے موقع پر ہوئی تھی اس کی جس قدر تفصیلات[۳] ہماری نظر سے گزری ہیں ان میں کسی ایسے مصحف کا تذکرہ نہیں ملتا جو خاص طور پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد سے منسوب کیا گیا ہو۔

استاذ طاہر الکردی نے مصحف مدینہ کے سلسلے میں مصری ہفتہ وار[۴] ''الدنیا وکل شیٔ'' کے حوالہ سے یہ اطلاع نقل کی ہے کہ یہ مصحف ترکوں کے ذریعہ جرمن شہنشاہ غلیوم ثانی کو ملا تھا؛ اس کی واپسی کے لیے حکومت المانیہ ایک معاہدے کے تحت آمادہ تھی اور چھ ماہ کے اندر حکومت حجاز کو لوٹا دینے کا ارادہ رکھتی تھی؛ کردی نے اس خبر کو غیر مصدقہ قرار دیا ہے۔

ایک مصری فاضل شیخ عبد العظیم زرقانی[۵] کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے کئی قدیم نسخے مصری دار الآثار اور کتب خانوں کی زینت ہیں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ زرقانی ان نسخوں کا انتساب عہد عثمانی سے صحیح نہیں سمجھتے، اس لیے کہ یہ تمام نسخے نقش ونگار اور زرکشی کے کام سے آراستہ ہیں۔ البتہ مسجد حسینی کے ایک قدیم مصحف سے انھوں نے بحث کرنے کی ضرورت سمجھی کہ بعض خطی شواہد کی بنا پر یہ نسخہ، مصحف مدنی اور مصحف شامی سے مطابقت رکھتا ہے۔ ان کا

(۱) تاریخ القرآن وغرائب رسمہ ص ۱۱۱-۱۱۲ مصر ۱۹۵۳ء (۲) کرد علی: خطط الشام (۷:۱۸۹)
(۳) رسالہ ''معارف'' (اعظم گڈھ) (۶۹:۲۱۶-۲۲۸)، (۷۰:۱۶۵-۱۸۴)
(۴) مؤرخہ ۲۸ جمادی الثانیہ ۱۳۵۷ھ مطابق ۲۴ر اگست ۱۹۳۸ء
(۵) مناہل العرفان (۱:۳۹۸)

اندازہ ہے کہ یہ نسخہ، ان دو عثمانی نسخوں میں سے کسی ایک کی نقل ہوسکتا ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے کسی زمانے میں دارالمصنفین اعظم گڈھ کو یہ اطلاع دی تھی کہ مصحف عثمانی کا عکس زار روس نے شائع کیا تھا؛ اسی سلسلے میں چند ماہ پیشتر ان کا ایک مکتوب (۱)''معارف'' اعظم گڈھ میں شائع ہوا جس میں ڈرہم یونیورسٹی کے نسخے کی نشاندہی کی گئی ہے۔

ایک روسی عکس کا تعارف قاضی اطہر مبارک پوری کے مضمون سے حاصل (۲) ہوتا ہے۔ یہ صرف سورۂ ''یسین'' کا عکس ہے جس کی اشاعت فوٹو بلاک کے ذریعہ ۱۹۰۵ء میں ایک روسی عالم عبداللہ الیاس بورغانی قریمی نے کی تھی؛ ان کی نظر سے یہ مصحف پیٹرس برگ کے شاہی کتب خانے میں ۱۸۸۹ء میں گزرا تھا؛ دوبارہ ۱۹۰۵ء میں انھوں نے سورۂ ''یسین'' کا فوٹو لیا، اور اس کی اشاعت بڑے اہتمام سے کی؛ اصل نسخہ بقول بورغانی خط کوفی میں چمڑے پر لکھا ہوا ہے اور اس کے صفحات کو کنارے کی طرف ٹیڑھا کر کے دیکھا جائے تو حروف شیشے کی طرح چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں، نیز آیت شریفہ ''**فسيكفيكهم الله**'' پر خون کے دھبے موجود ہیں۔ مضمون نگار نے جملہ تفصیلات کے بعد لکھا ہے ہوسکتا ہے کہ یہ مکمل نسخہ بعد میں ڈرہم یونیورسٹی میں منتقل ہوگیا ہو، لیکن اگر یہ مکمل نسخہ روس میں ہوتا تو کمیونسٹ حکومت ضرور اس کا پروپیگنڈا کرتی۔

مگر واقعہ یہ ہے کہ مملکت روس کے قبضے میں اس مصحف کا وجود ۱۹۵۹ء تک روسی اطلاعات (۳) کے ذریعہ ثابت ہوتا ہے اور اس کی تاریخ کے بارے میں بعض ایسی تفصیلات ملتی ہیں جن کا ذکر شیخ عبداللہ بورغانی قریمی کی تحریر میں نہیں ہے، روسی اطلاعات کا خلاصہ یہ ہے کہ مصحفِ عثمانی تیمور کے کتب خانے میں تھا، جو ۱۳۹۳ء میں دارالامارۃ سمرقند میں قائم کیا گیا تھا۔ پھر معلوم نہیں کن حالات کے تحت کتب خانے سے نکل کر سمرقند کی مسجد خواجہ احرار میں آ گیا اور صدیوں تک اس مسجد میں ایک مرمریں ستون سے زنجیروں کے ذریعہ معلق رہا۔ ۱۸۶۸ء میں روسی شہنشاہیت بخارا پر قابض ہوئی، اور غالباً روسی استیلاء کے بعد ہی ترکستان کے روسی گورنر جنرل (وان کاف مان) نے اس کو سو

(۱) رسالۂ ''معارف'' (اعظم گڈھ) (۸۶:۴۴۹-۴۵۰)

(۲) ایضاً جنوری ۱۹۶۱ء

(۳) رسالہ ''سوویت دیس'' (۲:۶) بابت جنوری ۱۹۵۹ء

روبل میں خرید کیا اور پٹرس برگ کے شاہی کتب خانے کو بطور تحفہ دے دیا۔

۱۹۱۷ء میں روسی انقلاب کے بعد انقلابی دستے کے مسلمان سپاہیوں نے اس کو اپنے قبضے میں کر لینا چاہا، مگر عارضی حکومت کی فوج نے ان کو اس سے باز رکھا۔ بالآخر پٹروگراد صوبائی مسلم کانگریس نے اس کی واپسی کا مطالبہ کیا اور مجلس وزراء کے حکم نامہ مورخہ ۹ دسمبر ۱۹۱۷ء کے مطابق یہ تاریخی مصحف روسی پارلیمان کے مسلم نمائندوں کے جلسہ میں اوفا پہنچا، پھر اسے تاشقند لایا گیا جو اس وقت ازبکستانی جمہوریہ کا پایہ تخت ہے۔ روسی نشریہ میں خون کے نشانات کا ذکر کیا گیا ہے اور اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ روسی مستشرقین نے اس کی قدامت تسلیم کی ہے۔

ان اطلاعات کی روشنی میں یقین کرنا پڑتا ہے کہ روسی نسخہ ڈرہم یونیورسٹی کو منتقل نہیں ہوا اور دونوں نسخے جداگانہ ہیں۔

۱۳/۷/۱۹۶۱ء

☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆

صفحہ ۱۶ کا بقیہ

من ص ۱۲۷ إلی ص ۱۳۲، وکذا الباب الثالث والرابع، ثم قابلنا هذه الأبواب بنسخة خطية لمولانا عبدالتواب الملتاني وصححنا بقدر الإمكان، ثم بعد ذلک قابلنا بنسخة أخرى (خطية) للمجلس العلمي في كراتشي، وهي نسخة جيدة مصححة من يد المحدث الشهير والعالم النحرير مولانا حبيب الرحمن الأعظمي.

یعنی ہم نے اس باب کو اسی طرح تیسرے اور چوتھے باب کو اولاً کتاب ابجد العلوم از صفحہ ۱۲۷ تا صفحہ ۱۳۲ نقل کیا، پھر ان ابواب کا حتی الامکان مقابلہ اور تصحیح مولانا عبدالتواب ملتانی کے قلمی نسخے سے کی؛ اس کے بعد ہم نے اس کا مجلس علمی کراچی کے ایک قلمی نسخے سے مقابلہ کیا، اور یہ نہایت ہی عمدہ نسخہ ہے، جس کی محدث شہیر اور عالم نحریر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کے ہاتھ سے تصحیح کی گئی ہے۔

الازہار المربوعہ

(مسلسل)

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

دفع اضطراب

مضعفین کے شمار کے بعد مجیب نے حدیث کی سند ومتن میں اضطراب ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اور اضطراب کی تفصیل کے پہلے آپ نے حضرت رکانہ کا شجرہ نسب پیش کیا ہے، مجھے وہ شجرہ پڑھ کے ہنسی آتی ہے؛ لیکن اس کے ساتھ ہی علوم وفنون کی بربادی پر رونا بھی آتا ہے، اور سب سے زیادہ تعجب وافسوس اس پر ہوتا ہے کہ لوگ سخت ناواقفیت کے باوجود علامہ بنے پھرتے ہیں، اور اپنی قدر پہچاننے سے پہلے علمی میدانوں میں کود پڑتے ہیں، مجیب کے ہوا خواہوں کو میری یہ عرض بری لگے گی، لیکن وہی خدا لگتی کہیں کہ جب اتنی معمولی بات بھی مجیب صاحب کو معلوم نہیں تو وہ اعلام مرفوعہ کا جواب کیا لکھیں گے، آپ ملاحظہ کیجئے کہ مجیب نے شجرہ نسب میں کیسے کیسے علمی جواہر پارے بکھیرے ہیں۔

ا:- رکانہ کے باپ عبد یزید انھیں ہاشم کے لڑکے ہیں، جن کے دوسرے لڑکے سرکار رسالت کے دادا عبد المطلب ہیں۔

۲:- عبد یزید اور عبد المطلب بھائی (ایک باپ کے دو لڑکے) ہیں۔

حالانکہ ان دونوں باتوں کی غلطی اظہر من الشمس ہے مگر بات وہی ہے کہ علم کی ضرورت ہے، بات یہ ہے کہ مجیب نے کہیں یہ لکھا دیکھ لیا کہ عبد یزید ہاشم کے بیٹے ہیں، پس فوراً اجتہاد کر بیٹھے کہ وہی ہاشم ہیں جو عبد المطلب کے باپ ہیں، حالانکہ بالکل یہ غلط ہے، عبد المطلب کے باپ ہاشم، عبد مناف کے بیٹے ہیں، اور عبد یزید کے باپ ہاشم مطلب کے بیٹے اور مطلب عبد مناف کے بیٹے ہیں، اور عبد یزید عبد المطلب کے بھائی نہیں بلکہ بھتیجے ہیں، صحیح شجرۂ نسب یہ ہے۔
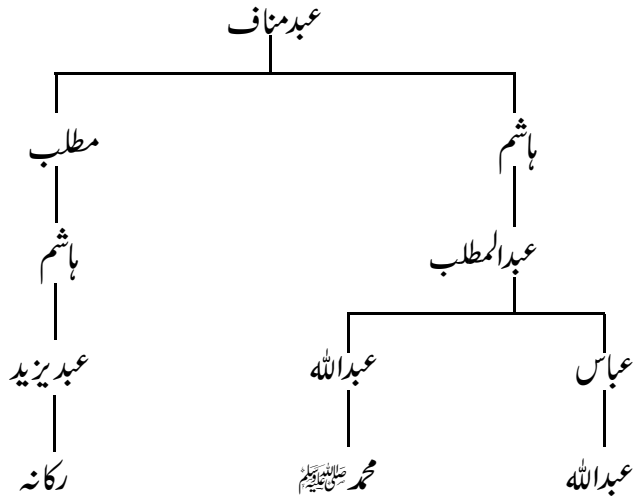
میرے بیان کے تصدیق کے لیے ملاحظہ ہو مستدرک حاکم تجرید ذہبی، خلاصہ، تہذیب، تقریب واکمال واصابہ وغیرہ۔ تجرید میں رکانہ کا نسب یوں ہے: رکانہ بن عبدیزید بن ہاشم بن المطلب بن عبدمناف اور مستدرک میں یوں ہے: رکانہ بن عبدیزید بن ہاشم بن المطلب بن عبدمناف اوراسی طرح اصابہ ج اص ۵۲۱ میں بھی ہے۔

اضطراب سند: بہر حال اب اضطراب کی تفصیل سنئے، مجیب نے سند میں یہ اضطراب دکھایا ہے کہ حدیث کا مدار دوراویوں پر ہے ایک عبداللہ بن علی بن سائب پر، دوسرے زبیر بن سعید پر، اور دونوں طریقوں میں اضطراب ہے، چنانچہ عبداللہ مذکور کے چار طریق ہیں اور چاروں باہم مختلف ہیں، ملاحظہ ہو:

۱:-**نافع بن عجير بن عبد يزيد بن ركانة ان ركانة بن عبد يزيد طلق** الخ۔

۲:-**نافع بن عجير بن عبد يزيد ان ركانة بن عبد يزيد طلق** دیکھئے پہلے طریق میں عبدیزید کو رکانہ کا بیٹا بتایا گیا ہے جو قطعاً غلط ہے۔ دوسرا طریق مثل پہلے کے ہے، لیکن اس میں عبد یزید کو رکانہ کا بیٹا نہیں بتایا گیا ہے۔

۳:-**عن نافع بن عجير عن ركانة بن عبد يزيد عن النبی** ﷺ.

دیکھئے اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ نافع واقعہ کے وقت موجود نہ تھے، بلکہ رکانہ سے روایت

کرتے ہیں، برخلاف طریق اول ودوم کے کہ اس میں یہ ہے کہ اس واقعہ کے وقت نافع حضور رسالت میں موجود نہ تھے۔

۴:-**ابن السائب عن نافع بن عجیر بن عبد یزید انه طلق** اس طریق میں رکانہ کے باپ عبد یزید کے طلاق دینے کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔اور طریق اول ودوم وسوم میں رکانہ کا طلاق دینا مذکور ہے (انتہی تقریر الاضطراب بمعناہ)

جواب:- میں تھوڑی دیر کے لیے مجیب کی اس......تقریر کو بالکل صحیح فرض کر کے خود انھیں کے الفاظ میں ان کو بتانا چاہتا ہوں کہ اضطراب ضعف کا باعث اس وقت ہوتا ہے جب دو مختلف روایتیں برابر درجہ کی ہوں؛ لیکن اگر ان میں سے کسی کا راوی دوسری روایت کے راوی سے قوت حفظ میں زیادہ ہو (الی قولہ) یا اسی قسم کی اور کوئی وجہ ترجیح ہو تو یہ اضطراب ضعف کا باعث نہیں، بلکہ ایسی صورت میں راجح کا اعتبار ہوگا (آثار ص ۳۶) پس صرف اختلاف دکھانے سے کچھ نہیں ہوسکتا، مجیب کو چاہئے کہ ان تمام مختلف طریقوں کا قوت میں مساوی ہونا بھی ثابت کریں۔ ناظرین دیکھیں کہ مجیب صاحب دوسروں سے جن قوانین وقواعد کی پابندی کرانا چاہتے ہیں جب اپنی باری آتی ہے تو ان کو بالکل بھول جاتے ہیں، یہی دیانت ہے اور اسی کا نام انصاف ہے۔

پھر مجیب کو یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ اضطراب ثابت کرنے کے لیے جس طرح تمام طرق مختلفہ کو قوت میں مساوی ثابت کرنا ضروری ہے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ ان طرق مختلفہ میں جمع ناممکن ہو، اور اگر جمع ممکن ہوگا تو اضطراب کا دعوی غلط ہوجائے گا۔ مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری لکھتے ہیں: **قد عرفت مرارا أن مجرد الاختلاف لا یکون اضطرابا بل الاضطراب موقوف علی شرطین، الأول أن یکون وجوه الاختلاف مستویة والثانی أن یتعذر الجمع علی قواعد المحدثین** یعنی تم بار بار جان چکے کہ محض اختلاف اضطراب نہیں ہوتا بلکہ اضطراب دو شرطوں پر موقوف ہے ایک وجوہ اختلاف کا برابر برابر ہونا اور دوسرے یہ کہ محدثین کے قواعد سے جمع دشوار ہو۔ (ابکار المنن ص ۱۷۶)

پس ناظرین کو معلوم ہونا چاہئے کہ مجیب نے اختلافات کو اپنی ناواقفیت کی وجہ سے یا بقصد ابلہ فریبی اضطراب کہا ہے، لیکن حقیقت میں خود ان کی اور مولانا مبارک پوری کی رائے کے مطابق ان

اختلافات کو اضطراب کہنا غلط ہے۔

اولاً تو وجوہ اختلاف متساوی نہیں ہیں، اس لیے کہ مجیب کی عبارت سے تین اختلاف مفہوم ہوتے ہیں: ایک یہ کہ کوئی ان رکانۃ کہتا ہے تو کوئی عن رکانہ، اس اختلاف کی نسبت گزارش ہے کہ اس حدیث کو عبداللّٰہ بن علی بن السائب سے محمد بن علی نے اور ان سے امام شافعی نے روایت کیا ہے اور امام شافعی سے ربیع، ابن السرح اور ابوثور وغیرہ نے یوں روایت کیا ہے: عن نافع ان رکانۃ، اور امام شافعی سے صرف حمیدی نے عن نافع عن رکانۃ روایت کیا ہے، اور کثرت تعداد بھی وجوہ ترجیح میں سے ہے، پس اس قاعدہ سے ان رکانۃ راجح اور عن رکانۃ مرجوح ہے۔

دوسرا اختلاف یہ ہے کہ تین پہلے طرق میں رکانہ کا واقعہ بتایا ہے اور چوتھے میں ان کے باپ کا۔

اس کی نسبت گزارش ہے کہ پہلے تو یہی سرے سے غلط ہے کہ چوتھے طریق میں رکانہ کے باپ کا واقعہ بتایا گیا ہے، مجیب صاحب غلط بیانی سے توبہ کریں ورنہ بتائیں کہ اس سے رکانہ کے باپ کے واقعہ کا مذکور [ہونا] کیسے سمجھا جاتا ہے؟ ناظرین انصاف کریں کہ ابن السائب عن نافع بن عجیر بن عبد یزید أنه طلق سے نافع کا طلاق دینا مفہوم ہوتا ہے یا عبد یزید کا جو رکانہ کے باپ ہیں؟ مجھے حیرت ہے کہ اس قابلیت پر مجیب صاحب کیا پڑھاتے ہوں گے! دوسرے چاہے نافع کا واقعہ اس طریق میں بیان ہوا یا رکانہ کے باپ کا، بہر حال یہ طریق پہلے تین کے مقابلہ میں مرجوح ہے، چنانچہ حافظ ذہبی نے تجرید میں اس کو زعفرانی کا وہم کہا ہے،[1] اور کہا ہے کہ حمیدی، ربیع، ابوثور (میں کہتا ہوں کہ نیز ابن السرح) نے زعفرانی کی مخالفت کی ہے یا نہیں، ظاہر ہے کہ چار کا بیان ایک کے بیان سے اقوی وارجح واولی ہے۔

تیسرا اختلاف یہ ہے کہ پہلے طریق میں عبد یزید کو رکانہ کا بیٹا کہا گیا ہے اور بقیہ میں ان کو رکانہ کا بیٹا نہیں کہا گیا ہے۔

اس کی نسبت گذارش ہے کہ عبد یزید کو رکانہ کا بیٹا کہنا کسی راوی کا وہم ہے اور اس کا وہم وغلط

---

(۱) ابن حجر نے بھی اس کے وہم ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے، لکھتے ہیں: فخالف الزعفرانی عن الشافعی عن محمد فی صاحب القصة وفی اسم المرأة (اصابہ ج۳ ص۵۴۶) اور تعلیق مغنی میں بھی یہ قول نقل کیا ہے (دیکھو ص ۴۴۹) ۱۲ منہ

ہونا ایسا بدیہی ہے کہ خود مجیب نے بھی صاف لکھا ہے کہ یہ قطعاً غلط ہے۔ (آثار ص ۶۱)

پس جب یہ قطعاً غلط تو اس کی وجہ سے بقیہ طرق پر اعتراض ناجائز ہے اور وجوہ اضطراب میں اس کو لکھنا اپنی بدحواسی کا مظاہرہ ہے۔

ثانیاً:- جب تیسری وجہ اختلاف باقرار مجیب قطعاً غلط ہے اور دوسری بتصریح ذہبی زعفرانی کا وہم ہے، تو اب صرف ان رکانة اور عن رکانة کا جھگڑا رہ گیا، پس اگر مذکورہ بالا وجہ ترجیح سے قطع نظر ہی کیا جائے تو یہ اختلاف ایسا ہے کہ اس میں جمع ممکن ہے اور ایسے اختلافات سے صحیحین کی حدیثیں بھی خالی نہیں ہیں، جن کی صحت پر مجیب کے خیال میں اجماع ہو چکا ہے، پس اگر اس اختلاف کو موجب اضطراب کہیں گے تو صحیحین کی مزعومہ اجماعی صحت سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اس اجمال کا بیان یہ ہے کہ ان اور عن دونوں صحیح ہے، اولاً تو نافع بن عجیر کو متعدد مصنفین نے صحابہ میں شمار کیا ہے، پس ہوسکتا ہے کہ انھوں نے اس واقعہ کا مشاہدہ بھی کیا ہو اور ان سے رکانہ نے اپنا واقعہ بیان بھی کیا ہو، اس لیے کبھی نافع اپنے مشاہدہ کی حکایت کرتے ہوئے ان رکانة کہتے ہوں اور کبھی رکانہ کے بیان کا حوالہ دیتے ہوئے عن رکانة کہتے ہوں۔

اس مقام پر مجیب کی ایک غلط بیانی کا اظہار ضروری ہے، فرماتے ہیں ''بجز بغوی کے اور کوئی ان (نافع) کو صحابہ میں شمار نہیں کرتا، ابن حبان وغیرہ نے ان کو تابعین میں شمار کیا ہے (اصابہ وتقریب)'' (آثار ص ۶۱)

حالانکہ بغوی کے علاوہ ابونعیم [1]، ابوموسی مدینی، اور خود ابن حبان [2] نے ان کو صحابہ میں ذکر کیا ہے (دیکھو بذل واصابہ ج ۳ ص ۵۴۶) اور ذہبی نے تجرید اسماء الصحابہ میں ان کو ذکر کیا ہے، پس صرف بغوی کا نام لینا اور ابن حبان کی نسبت صرف یہ کہنا کہ انھوں نے ان کو تابعین میں شمار کیا ہے دو غلط بیانیاں ہیں، نیز مذکورہ بالا بیان کے لیے تقریب کا حوالہ دینا بھی غلط ہے، اس لیے کہ اس میں جس طرح یہ مذکور ہے کہ ابن حبان نے ان کو تابعین میں ذکر کیا ہے، اسی طرح یہ بھی مذکور ہے کہ قیل

---

(۱) ابونعیم وابوموسی کا حوالہ ذہبی نے بھی دیا ہے ۱۲ منہ

(۲) ابن حبان جلد اول قلمی ورق ۱۶۷ میں ہے: نافع بن عجیر بن عبد یزید له صحبة اھ یہ عبارت میں نے بچشم خود ابن حبان میں دیکھی اور اس سے نقل کی ہے، مجیب کو معلوم ہونا چاہئے کہ جلد اول میں ابن حبان نے صرف صحابہ کو ذکر کیا ہے اور نافع کے حال میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں لکھا ہے ۱۲ منہ

له صحبة (یہ بھی کہا گیا ہے کہ نافع کو صحبتِ رسول ﷺ حاصل ہے)

ثانیاً:- اگر نافع کو صحابی نہ مانتے تب بھی ان اور عــــن دونوں صحیح ہیں اور صورت یہ ہے کہ انھوں نے حضرت رکانہ سے ان کا واقعہ سنا ہے، خود واقعہ کے وقت موجود نہ تھے، لیکن بیان کرنے کے وقت کبھی حضرت رکانہ کا حوالہ ذکر کر جاتے ہیں اور کبھی چھوڑ دیتے ہیں، اور حفاظ وثقات رواۃ بکثرت ایسا کیا کرتے ہیں، کہ جس سے حدیث سنی ہے کبھی اس سے روایت کرنے کی تصریح کرتے ہیں[1] اور کبھی چھوڑ جاتے ہیں، مقدمہ مسلم میں اس کے نظائر پڑھئے اور امام مسلم کا یہ قول بھی ملاحظہ کیجئے: **یرسل عنه أحياناً ولا يسمى من سمع منه وينشط أحيانا فيسمى الذى حمل عنه الحديث ويترك الارسال** (مقدمہ مسلم) اور امام بیہقی کہتے ہیں: **من شان اهل العلم ان يروى الحديث مرة فيوصله ويرويه أخرى فيرسله** اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ امام شافعی کے علاوہ محمد بن علی سے جس نے روایت کیا ہے، یا محمد بن علی کے علاوہ عبداللہ بن علی بن السائب سے جس نے اس کو روایت کیا ہے اس نے ہی **عن ركانة قال انى طلقت الخ** یا **عن عمه ركانة** کی تصریح کی ہے، (دیکھو مسند طیالسی اور تعلیق مغنی)

یہیں سے ایک اور وجہ ترجیح بھی مستفاد ہوتی ہے اور میرے نزدیک یہی زیادہ صحیح ہے، پہلی دو ترجیح تو میں نے اس بنا پر لکھ دی ہے کہ مجیب نے صرف حضرت امام شافعی کے شاگردوں کی روایات مختلفہ کو پیش کیا ہے، پس اس محدود دائرے کے اندر وہ ترجیح نافذ ہے اور اگر دائرہ کو وسیع کیجئے اور ان طرق کو بھی لیجئے جو تلامذۂ شافعی سے اوپر کے ہیں، تو **عن ركانة** راجح ہے، اس لیے کہ **أن ركانة** صرف امام شافعی کے طریق میں ہے اور وہ اس اختلاف کے ساتھ کہ شافعی کا بھی کوئی شاگرد انَ کہتا ہے اور کوئی عن، لیکن امام شافعی کے علاوہ محمد بن علی سے جس شخص نے روایت کی ہے (اور وہ میرے نزدیک طیالسی ہیں) ان کے طریق میں بلا اختلاف عــــن ہے، اسی طرح عبداللہ بن علی بن السائب سے جس جس نے روایت کیا ہے اور وہ زبیر بن سعید[2] اور ابراہیم ابن محمد ہیں ان کے طریقوں میں بھی بلا اختلاف عن ہے (دیکھو مسند طیالسی، تعلیق، اور دار قطنی) اس لیے عن راجح ہے۔

اب صرف ایک بات رہی جاتی ہے کہ مجیب نے طریق سوم کے لفظ **عن ركانة** ....

(۱) ابکار المنن ص ۱۲۶ (۲) بشرطیکہ یہ طریق محفوظ ہو ۱۲ منہ

عن النبی ﷺ پر اپنے خیال میں خوب آوازے کسے ہیں، فرماتے ہیں:

''دوسری بات جو عجوبہ روزگار بننے میں اپنی آپ نظیر ہے، یہ ہے کہ رکانہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ رکانہ بن عبد یزید نے اپنی بی بی سہیمہ کو بتہ طلاق دی۔ اب صرف اتنی ہی کسر باقی رہ گئی ہے کہ عن اللہ تعالیٰ کہہ کر اس کو حدیث قدسی بنا دیا جائے اور العدل میں بھیج دیا جائے کہ اڈیٹر صاحب جلی قلم سے ایک ولولہ انگیز سرخی قائم کر کے اس کو شائع کر دیں'' (آثار ص ۶۱)

مگر اہل علم جانتے ہیں کہ یہ ''ارشاد'' بھی خود مجیب ہی کے علم وفہم کا قصور ظاہر کر رہا ہے، اولاً تو جو عبارت مجیب نے نقل کی ہے اس میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جو خط کشیدہ فقرہ پر دلالت کرتا ہو، لہذا یہ مجیب کی غلط بیانی ہے۔

ثانیاً:- مجیب کو مدرسی کرتے ہوئے اتنے دن ہو گئے، لیکن اب تک آپ کو خبر نہیں ہے کہ ایسے مقامات میں جب محدثین عن النبی ﷺ بهذ الحدیث لکھا کرتے ہیں تو اصل حدیث نبوی، یعنی صرف آنحضرت ﷺ کے قول کا رفع (یعنی آپ سے مرفوعاً مروی ہونے کا اظہار) مقصود ہوتا ہے، باقی صورت واقعہ، یا سوال سائل یا شان ورود کے آنحضرت ﷺ سے مروی ہونے کا اظہار مقصود نہیں ہوگا۔ اس کی ایک نہیں صدہا مثالیں مل سکتی ہیں، اور اہل علم کے نزدیک تو یہ اتنی معمولی بات ہے کہ اس کے بیان کی کوئی ضرورت نہیں، لیکن یہاں سابقہ پڑا ہے ایک ''حضرت مولانا'' سے، اس لیے اس کتاب سے ایک مثال پیش کی جاتی ہے جس کی صحت پر مجیب کے خیال میں اجماع ہے، صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۱ میں ہے: **وحدثنی محمد بن حاتم .... (الی) .... موسی بن طلحة یحدث عن أبی أیوب عن النبی ﷺ بمثل هذا الحدیث** اس کو پڑھ کر مجیب صاحب بتائیں کہ ان کے قاعدہ سے اس عبارت کا بجز اس کے اور کیا مطلب ہوسکتا ہے کہ ابوایوب آنحضرت ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ناقہ کی نکیل پکڑ لی الخ۔ بہتر ہوگا کہ کم سے کم مسلم میں ایسی جتنی حدیثیں ہوں صرف عن اللہ تعالیٰ کا اضافہ کر کے ان سب کو احادیث قدسیہ قرار دے کر سلسلہ وار اخبار اہل حدیث میں مجیب صاحب شائع کرنا شروع کر دیں، یقیناً آپ کی اس خدمت حدیث کا اخبار محمدی وغیرہ میں کسی ولولہ انگیز سرخی کے ماتحت اعلان کیا جائے گا، اور مقصود دلی بر آئے گا۔ مجیب صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ صرف قولی احادیث ہی کے ساتھ

محدثین کی یہ عادت نہیں ہے، بلکہ فعلی وتقریری کے لیے بھی اس کو استعمال کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو صحیح مسلم ج۱ص۲۲ **رووا عن هشام بن عروة عن أبيه عن عائشة كنت أطيب رسول الله ﷺ لحله ولحرمه بأطيب ما اجد فروى هذه الرواية بعينها الليث بن سعد............ الى............ عن هشام قال اخبرنى عثمان بن عروة عن عروة عن عائشة عن النبى ﷺ** کہئے مجیب صاحب! کیا یہاں بھی کہئے کہ حضرت عائشہ آنحضرت ﷺ سے روایت کرتی ہے کہ میں آنحضرت ﷺ کو خوشبو لگایا کرتا تھا اور کیا یہ عن اللہ تعالیٰ کے اضافہ کا بہترین موقع نہیں ہے؟

زبیر بن سعید کی تین سندیں مجیب نے ذکر کی ہیں، اور ان کی نسبت بجز اس کے اور کچھ نہیں لکھا ہے کہ پہلی (۱) میں واقعہ بیان کرنے والے رکانہ ہیں، اور تیسری میں ان کے بیٹے یزید، اور دوسری میں رکانہ کو عبداللہ بن علی بن سائب کا دادا بتایا گیا ہے، حالانکہ عبداللہ کے دادا سائب ہیں انتہی بمعناہ۔

ناچیز کہتا ہے کہ اس بات کو تو بیان اضطراب میں کوئی دخل نہیں کہ ''رکانہ کو عبداللہ کا دادا بتایا گیا ہے'' لہذا اس کا ذکر یہاں پر نادانی یا ابلہ فریبی ہے۔ اب رہا اس کا جواب تو وہ بالکل کھلا ہوا ہے، ناظرین مجیب کا لکھا ہوا شجرہ نسب دیکھ کر معلوم کر سکتے ہیں کہ رکانہ، عبداللہ کے پردادا کے بھائی ہیں، اور دادا یا پردادا کے بھائی کو ہر زبان میں مجازاً دادا کہہ دیا کرتے ہیں، اس طرح کا مجاز قرآن کریم میں بھی ہے، چنانچہ حضرت یوسف کے آباء (باپ دادا) کے سلسلہ میں حضرت اسماعیل کا نام بھی مذکور ہے، باوجودیکہ حضرت اسماعیل حضرت یوسف کے دادا نہیں بلکہ دادا کے بھائی ہیں۔ علاوہ بریں اس بات میں ابن المبارک کے شاگرد اسحاق بن اسرائیل متفرد ہیں، ابن المبارک کے دوسرے شاگرد حبان، جریر کے تمام شاگردوں کی طرح عبداللہ بن علی بن السائب کو زبیر کا استاد بیان کرنے کے بجائے عبداللہ ابن علی بن یزید الخ کو زبیر کا استاد بیان کرتے ہیں، اور حبان صحیحین کے راوی ہیں، اور ان کو کسی نے مجروحین میں ذکر نہیں کیا ہے، برخلاف اسحاق کے کہ وہ حافظ وصدوق ہونے کے ساتھ متکلم فیہ بھی ہیں، اسی لیے ابن حجر نے حبان کے لیے دوسرے درجہ کی توثیق کا لفظ اور اسحاق کے لیے چوتھے درجہ کی توثیق کا لفظ لکھا ہے، بہرحال اس سے صاف ظاہر ہے کہ حبان کا طریق فی حد نفسہ

(۱) چونکہ مجیب نے ابن سائب اور زبیر دونوں کی سندوں کو ایک سلسلہ میں ذکر کیا ہے اس لیے زبیر کی پہلی سند کو پانچویں، اور دوسری کو چھٹی اور تیسری کو ساتویں لکھا ہے، اس کو یاد کر کے اس نقل کو اصل آثار سے ملایئے ۱۲ منہ

اور بلحاظ شواہد ومتابعات کے بھی اقوی ہے۔

اب رہا یہ کہ ''پہلی میں واقعہ کے بیان کرنے والے رکانہ ہیں اور تیسری میں ان کے بیٹے یزید'' تو یہ سراسر غلط ہے اور اس کے لیے بذل المجہود کا حوالہ دینا غلط بیانی وفریب ہے، بذل المجہود میں یہ کہیں بھی نہیں ہے، اگر مجیب نے اس حوالہ سے وہی عبارت مراد لی ہے جو آثار ص ۴۷ میں نقل کی گئی ہے تو ناظرین اس عبارت کا وہی ترجمہ جو مجیب نے کیا ہے پڑھ کر ان کی مشق غلط بیانی کی داد دے سکتے ہیں، بذل المجہود میں تو اس مقام پر خود مجیب کے بیان کے مطابق لکھا ہے کہ یزید بھی ہو سکتے ہیں اور رکانہ بھی (دیکھو آثار ص ۴۷ و ۴۸)

علاوہ بریں اگر بفرض محال کسی نے مذکورہ بالا بات لکھی بھی ہوتی تو مجیب کے لیے کچھ مفید نہ ہوتی تاوقتیکہ وہ یہ ثابت نہ کریں کہ دونوں سندوں میں کسی ایک شخص کو واقعہ کا بیان کرنے والا قرار دینا ناممکن ہے، اگر بنارس وامرتسر وغیرہ سے مدد لے کر اس کو ناممکن ثابت کر دیا جائے تو بے شبہہ اضطراب ثابت ہو جائے گا، لیکن اگر نہ ثابت ہوا اور قیامت تک ثابت نہیں ہو سکتا تو اضطراب کا بھی یہی حال ہوگا۔

ناظرین کو معلوم ہونا چاہئے کہ پہلی سند میں تو مجیب کو خود تسلیم ہے کہ واقعہ بیان کرنے والے رکانہ ہیں (آثار ص ۶۲) اب رہی تیسری سند تو وہ وہی ہے جس کو میں نے اعلام ص ۸ میں ابوداؤد وابن ماجہ ودارقطنی کے حوالہ سے نقل کیا ہے، چنانچہ مجیب نے بھی آثار ص ۶۲ میں اس کے لیے دارقطنی صفحہ ۴۳۹ کا حوالہ دیا ہے، اور ناظرین کو یاد ہوگا کہ مجیب صاحب آثار ص ۴۷ میں اعلام سے اس سند کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ ''اختلاف ہے کہ رکانہ سے مروی ہے یا نہیں'' لہذا یہاں پر اس اختلاف کو بھول جانا، اور صرف یزید کو واقعہ بیان کرنے والا لکھنا، اولاً تو دیانت کے خلاف ہے، دوسرے ص ۴۷ کا ''ارشاد'' صاف بتا رہا ہے کہ اس سند میں واقعہ بیان کرنے والے حضرت رکانہ بھی ہو سکتے ہیں، ورنہ جس اختلاف کا ذکر کیا ہے وہ محال ہو جائے گا، پس جب اس سند میں بھی حضرت رکانہ واقعہ بیان کرنے والے ہو سکتے ہیں تو اس سند اور پہلی سند میں تطبیق ممکن ہوگئی، اور امکان تطبیق کے بعد دعوی اضطراب جہالت ہے۔

یہ تو مجیب کے مسلمات کی بنا پر تھا، اور تحقیقی بات یہ ہے کہ اس سند میں بھی واقعہ بیان کرنے

والے یقیناً حضرت رکانہ ہیں (دیکھو رسالہ ہذا ص)

اس کے ساتھ مجیب صاحب کی غلط بیانی قابل دید ہے کہ پہلی سند (یعنی مجیب اپنے حساب سے پانچویں) کو نقل کر کے لکھتے ہیں "اس سند پر مفصل بحث مولف کے پانچویں اعتراض کے جواب میں کی گئی ہے" (ص ۶۱)

ناظرین آثار ص ۷۴ میں دیکھ سکتے ہیں کہ مجیب نے پانچویں اعتراض کے جواب میں اس سند پر بحث کی ہے جس کو میں نے اعلام ص ۸ میں نقل کیا ہے، اور اعلام ص ۸ دیکھ کر معلوم کر سکتے ہیں کہ میں نے وہ سند ابوداؤد، ابن ماجہ اور دارقطنی سے نقل کی ہے، برخلاف اس پہلی سند (مجیب کی پانچویں) کے کہ اس کو مجیب نے اصابہ سے نقل کیا ہے (دیکھو آثار ص ۶۱) مجیب خود بولیں کہ یہ غلط بیانی ہوئی یا نہیں؟

اگر فرمائیں کہ اعلام ص ۸ والی سند اور یہ سند ایک ہی ہے بات صرف یہ ہے کہ اعلام میں کتب مذکورہ بالا سے وہ نقل کی گئی اور آثار ص ۶۱ میں اصابہ سے نقل کی گئی ہے، تو گزارش ہے کہ یہ ارشاد بالکل مسلم، لیکن اب جناب کا یہ ارشاد غلط ہو گیا کہ "پہلی اور تیسری میں یہ فرق ہے کہ پہلی میں واقعہ کے بیان کرنے والے رکانہ ہیں اور تیسری میں ان کے بیٹے یزید" اس لیے کہ جب تیسری سند میں وہی ہے جو اعلام ص ۸ میں ہے اور اس تقدیر پر آپ کے قول سے اعلام میں پہلی ہی سند ہے، تیسری سند بعینہ پہلی ہے اور جب یہ دونوں ایک ہیں تو مذکورہ بالا فرق غلط ہے، بہر حال مجیب کا ایک ارشاد ضرور غلط ہے، علاوہ بریں اس صورت میں اس سند کو دوبار ذکر کرنا مغالطہ ہے، نیز اس قول سے زبیر کی سندوں کے اضطراب کا دعوی خود آپ کے اعتراف سے ہباءً منثورا ہو جائے گا، نیز ص ۷۴ میں اس حدیث کے رکانہ کی روایت ہونے سے انکار کرنا بھی غلط ہو جائے گا فتدبر۔

(جاری ہے)

اثنا عشری امامی شیعہ مذہب کے خدوخال

تحریر: سید محبّ الدین خطیب مصری ترجمہ: مسعود احمد الاعظمی

اسلامی مذاہب اور فرقوں کے درمیان قربت پیدا کرنے کا مسئلہ

مسلمانوں کے درمیان ان کی سوچ، رجحانات اور مقاصد کے لحاظ سے قربت اور ہم آہنگی پیدا کرنا اسلام کے عظیم ترین مقاصد میں سے ایک ہے، اور یہ چیز طاقت، ترقی اور اصلاح کا ایک اہم ذریعہ ہے، اور اس میں ان کی مختلف اقوام اور ان کی اجتماعیت وشیرازہ بندی کے لیے ہر دور میں اور ہر جگہ خیر ہے۔

اس قربت کی طرف دعوت اگر (ذاتی) اغراض سے اوپر اٹھ کر ہو، اور تفصیلات میں جانے کے بعد وہ کسی ایسے نقصان کا پیش خیمہ نہ بنتی ہو جو اس کے متوقع فائدے پر پانی پھیر دے، تو ہر مسلمان کے لیے اس کو قبول کرنا اور اس کو کامیاب بنانے کے لیے مسلمانوں کا ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا ضروری ہے۔

گزشتہ چند برسوں سے قربت کی اس دعوت کے بارے میں کثرت سے گفتگو ہو رہی ہے، پھر اس گفتگو کا دائرہ کار بڑھتا رہا حتی کہ جامع ازہر تک پہنچ گیا، جو کہ مذاہب اربعہ کی طرف منسوب اہل سنت کا سب سے مشہور اور سب سے عظیم الشان دینی ادارہ ہے، جامع ازہر نے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان قربت پیدا کرنے کے اس نظریے کو اس سے زیادہ وسیع پیمانے پر اختیار کیا جس پر وہ سلطان صلاح الدین ایوبی کے زمانے سے لے کر اب تک عمل پیرا رہا ہے، چنانچہ جامع ازہر نے دوسرے مذاہب سے تعارف حاصل کرنے کے لیے اپنی حد سے آگے بڑھ کر عمل کیا، ان مذاہب میں سرفہرست اثنا عشری امامی شیعہ مذہب ہے، لیکن ازہر اس سلسلے میں اب تک وہیں ہے جہاں سے اس نے سفر شروع کیا تھا، اس لیے یہ انتہائی اہم موضوع اس لائق ہے کہ ہر وہ مسلمان جس کو

اس سے کچھ واقفیت ہے اس کا مطالعہ کرے، جائزہ لے اور تحقیق کرے، اور اس سے پیدا ہونے والے اثرات ونتائج سے واقفیت اور آگاہی حاصل کرے۔

چونکہ مذہبی مسائل فطری طور پر دشوار اور پُر خار ہوتے ہیں، اس لیے ان کا حل بھی حکمت ودانائی اور عقل مندی سے ہونا چاہئے، اور ان مسائل کے مطالعہ اور تجزیہ کرنے والے کو ان کی اندرونی باتوں سے واقف ہونا چاہئے، اس کے دل میں نور خداوندی اور فیصلے میں عدل وانصاف پسندی ہونی چاہئے، تاکہ مسئلے کے حل کی کوشش با مقصد ہو اور مفید نتائج تک پہنچا سکے۔

اس معاملے میں- نیز ہر اس معاملے اور مسئلے میں جو کئی فریق سے متعلق ہوتے ہیں- سب سے پہلی چیز ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ دونوں فریقوں یا تمام فریقوں کے درمیان موافقت اور ہم آہنگی ہو۔

مثال کے طور پر ہم سنی اور شیعہ کے درمیان قربت پیدا کرنے کے مسئلے کو لیتے ہیں، دیکھا یہ گیا کہ دونوں کو قریب اور نزدیک لانے کی دعوت کے لیے مصر میں ایک ادارہ قائم کیا گیا، جس کے اخراجات ایک شیعہ گورنمنٹ کے سرکاری بجٹ سے ادا ہوتے ہیں، اس ''شریف'' شیعہ حکومت نے ہمارے ساتھ شریفانہ ایثار اور مراحم خسروانہ سے کام لیتے ہوئے سرکاری فراخ دلی کا مظاہرہ کیا، اور اپنے لیے نیز اپنے ہم مذہب لوگوں کے لیے بخل سے کام لیا۔ چنانچہ ''طہران'' یا ''قُم'' یا ''نجف'' یا ''جبل عامل'' یا ان کے علاوہ شیعہ مذہب کے نشر واشاعت اور پروپیگنڈہ کے مراکز میں تقریب (شیعہ سنی کو نزدیک لانے) کا ادارہ قائم کرنے کے لیے اس جیسی سخاوت اور دریا دلی سے کام نہیں لیا۔

شیعی پروپیگنڈہ کے ان نشریاتی مراکز سے حالیہ برسوں میں ایسی لرزہ خیز اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی کتابیں شائع ہوئی ہیں جو یکجہتی اور باہمی آہنگی کے نظریے کو زمیں بوس کر دیتی ہیں، ان کتابوں میں ایک ''الزہراء'' نامی تین جلدوں میں کتاب ہے، جس کو علماء نجف نے شائع کیا ہے، اس کتاب میں امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر (معاذ اللہ) اغلام بازی کی تہمت لگائی گئی ہے، اس کتاب کو الجزائر کے ایک بزرگ عالم شیخ بشیر ابراہیم نے عراق کے اپنے پہلے سفر کے دوران وہاں دیکھا ہے، تو وہ گندی روح جس سے اس طرح کی بدزبانی اور بیہودہ گوئی کا اظہار ہوتا ہو، وہ یکجہتی کی دعوت کی ہم اہل سنت سے زیادہ محتاج ہے، اور جب کہ ہمارے اور ان کے درمیان ایک بنیادی فرق

اوراختلاف ہے، جس کی اساس ان کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ہم سے زیادہ اہل بیت سے محبت کرنے والے ہیں، اوران کا کوئی ڈھکا چھپا نہیں بلکہ کھلم کھلا یہ دعویٰ ہے کہ وہ اپنے دل میں صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) سے جن کے دم سے اسلام کو سر بلندی نصیب ہوئی ہے یہاں تک بغض اور کینہ رکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شان میں اس طرح کی بیہودگی اور یاوہ گوئی کرتے ہیں، تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے ائمہ مسلمین کے سلسلے میں اپنے دلوں کے اندر موجود بغض وکینہ میں کمی لائیں، اور اہل بیت کے تئیں مسلمانوں کے شرافت آمیز موقف اور ان کے عزت واحترام میں کوئی کوتاہی نہ کرنے کا اعتراف کریں، الا یہ کہ احترام میں کمی اور کوتاہی کا مطلب یہ ہو کہ ہم ان کو معبود مان کر اللہ کے ساتھ شریک نہیں کرتے، جیسا کہ دوسرے علاقوں میں موجود ان کے ان مقامات میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے، جن سے ہم کو قریب کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

ہم آہنگی کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ ان دونوں فریقوں کی طرف سے ہو جن کو ملانے اور قریب کرنے کی کوشش ہوتی ہے، اور ہم آہنگی اسی وقت ممکن ہے جب کہ منفی (negative) مثبت (positive) سے مل جائے نہ یہ کہ قریب کرنے اور اس کو عمل میں لانے کا کام یکطرفہ ہو جیسا کہ اس وقت ہو رہا ہے۔

صرف اہل سنت کے مرکز مصر میں یکطرفہ تقریب کے بارے میں جو کہا جارہا ہے، اور شیعہ مذہب کے بڑے بڑے شہر، ان ستم رانی، نشر واشاعت اور پروپیگنڈہ کے مراکز کو جو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، اسی طرح جامع ازہر کے تعلیمی نصاب میں اس تقریب ویکجہتی کے مضمون کو داخل کرنے کے بارے میں جو کہا جاتا ہے اور اس کے بالمقابل شیعوں کے تعلیمی اداروں کو چھوڑ دیا جاتا ہے، تو جب تک صرف ایک فریق پر توجہ مبذول ہوگی، کامیابی ممکن نہیں ہے، اور صرف ناکام رہ جائے اس پر کوئی ناگوار اور ناپسندیدہ ردعمل مرتب نہ ہو تو یہی غنیمت ہے۔

تعارف اور باہمی ہم آہنگی کے اسباب میں یہ تو سب سے کمتر درجہ ہے کہ اصولی باتوں سے پہلے فروعی باتوں سے شروع کیا جائے، اور اصولی اختلاف کو نظر انداز کر کے فروعی اختلاف کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

فقہ اسلامی

فقہ اسلامی کا مرجع اور سرچشمہ اہل سنت اور شیعہ ہر دو فریق کا مختلف ہے، اہل سنت کے ائمۂ اربعہ کے نزدیک تشریع اور قانون سازی جن بنیادوں پر قائم ہے، شیعوں کے نزدیک قانون سازی کی بنیاد اس سے مختلف ہے، اور فروعی باتوں کی طرف توجہ دینے سے پہلے جب تک ان بنیادوں اور اصولوں پر دونوں فرقوں کے تعلیمی اور دینی اداروں میں جانبین سے مفاہمت اور گفت وشنید نہیں ہوتی، تو اصول سے پہلے فروع میں وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، اور یہاں اصول سے مراد اصول فقہ نہیں ہے، بلکہ فریقین کے اصول دین ہیں، جس کی جڑ میں یہ مسائل ہیں:

تقیہ کا مسئلہ

ہمارے اور شیعوں کے درمیان اخلاص کے ساتھ سچی ہم آہنگی ویکجہتی کے راستے میں اولین رکاوٹ ان کا وہ مسئلہ ہے جس کو ''تقیہ'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں، یہ ان کا ایک ایسا مذہبی عقیدہ ہے جو ان کے لیے اس بات کا جواز فراہم کرتا ہے کہ جو ان کے باطن میں ہے اس کے خلاف ظاہر کریں، جس کی وجہ سے ایک سادہ دل آدمی ان کی اتحاد ویکجہتی کی خواہش کے اظہار سے دھوکہ کھا جاتا ہے، حالانکہ ان کا یہ ارادہ نہیں ہوتا ہے، نہ اس سے وہ راضی ہوتے ہیں اور نہ اس کے مطابق عمل کرتے ہیں، سوائے اس کے کہ یکجہتی کا یہ عمل یکطرفہ کارروائی ہو کر رہ جاتا ہے، اور دوسرا فریق اپنے موقف سے ایک بال برابر بھی نہیں ہٹتا۔ اور اگر عمل تقیہ کے اداکار ہم کو مطمئن بھی کرلیں کہ انھوں نے ٹھوس قدم اٹھایا ہے، تو ان کے علاوہ تمام کے تمام شیعہ چاہے عوام ہوں یا خواص ان کی اس مضحکہ خیز اداکاری سے الگ تھلگ رہیں گے، اور جو لوگ ان کی ترجمانی کریں گے وہ سارے شیعہ ترجمانی کے ان کے حق کو تسلیم ہی نہیں کریں گے۔

قرآن کریم میں عیب نکالنا

حتی کہ قرآن کریم بھی جس کو ہمارے اور ان کے درمیان اتحاد کے پیغام کا ایک جامع مرجع ہونا چاہئے تھا، شیعوں کے نزدیک اصول دین کی بنیاد اس کی آیات کی تاویل اور ان آیات کے رخ کو ایسے معانی کی طرف پھیر دینے پر قائم ہے، جو اس سے مختلف ہے جس کو صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سمجھا ہے، اور جن کو ائمۂ اسلام نے ان لوگوں سے سمجھا ہے جن کے سامنے قرآن

نازل ہوا ہے، بلکہ نجف کے ایک بڑے عالم مرزا حسین بن محمد تقی نوری طبرسی نے - جن کا شیعوں کے نزدیک یہ مرتبہ ہے کہ جب ۱۳۲۰ھ میں ان کی موت ہوئی ہے تو انھوں نے ان کو نجف کے مقبرۂ مرتضوی میں بانو عظمیٰ بنت سلطان ناصر لدین اللہ کے حجرہ کے دیوان میں دفن کیا ہے، اور یہ جگہ نجف اشرف میں جو کہ شیعوں کے نزدیک روئے زمین کا سب مقدس حصہ ہے قبلہ کے دروازے سے صحن مرتضوی کی طرف داخل ہونے والے کے داہنی طرف قبلہ کی سمت واقع ہے -، تو اس نجفی عالم نے ۱۲۹۲ھ میں نجف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب قبر کے پاس ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ''**فصل الخطاب في إثبات تحريف كتاب رب الأرباب**'' رکھا ہے، اس میں اس شیعہ عالم نے مختلف زمانے کے شیعہ علماء اور مجتہدین کی سیکڑوں عبارتیں جمع کی ہیں کہ قرآن کے اندر کمی بیشی کی گئی ہے، طبرسی کی یہ کتاب ۱۲۸۹ھ میں ایران میں طبع ہوئی ہے، اور اس کی طباعت سے ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا تھا، کیونکہ شیعہ یہ چاہتے تھے کہ قرآن کی صحت کو مشکوک قرار دینا ان کے خاص افراد کے اندر محصور رہے، اور ان کے نزدیک معتبر سیکڑوں کتابوں میں یہ منتشر رہے، اور اس کو اس طرح یکجا نہ کردیا جائے کہ اس کے ہزاروں نسخے چھاپے جائیں اور ان کے مخالفین بھی اس سے واقف ہوجائیں، جس کا نتیجہ یہ ہو کہ وہ ان کے خلاف ایسی حجت بن جائے جو ہر شخص کی نگاہ کے سامنے ہو۔ جب شیعہ دانشوروں نے اس کی طباعت پر یہ ریمارک کیا تو اس کتاب کے مصنف نے ان کے نقطۂ نظر سے اختلاف کرتے ہوئے ایک دوسری کتاب ''**رد بعض الشبهات عن فصل الخطاب في إثبات تحريف كتاب رب الأرباب**'' کے نام سے لکھی، اس نے اپنے دفاع میں یہ دوسری کتاب اپنی زندگی کے آخری حصے میں مرنے سے دو سال پہلے لکھی تھی۔ اور قرآن کو محرف ثابت کرنے کی کاوش کا شیعوں نے اس کو انعام یہ دیا کہ نجف کے مشہد علوی کے اس ممتاز مقام پر دفن کیا۔

اس نجفی عالم نے قرآن کے اندر کمی پر جن باتوں سے استدلال کیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ اپنی کتاب کے صفحہ ۱۸۰ پر ایک سورہ ذکر کی ہے جس کو شیعہ ''سورة الولاية'' کہتے ہیں، اس میں حضرت علی کی ولایت ذکر کی گئی ہے کہ (**يا أيها الذين آمنوا آمنوا بالنبي والولي الذين بعثنا هما يهديانكم إلى الصراط المستقيم الخ**) اور ایک قابل اعتماد اور بھروسہ مند شخص استاذ محمد علی سعودی نے - جو مصر کی وزارت انصاف کے تجربہ کار وزیر اور شیخ محمد عبدہ کے خاص

شاگردوں میں تھے- مستشرق براین کے پاس ایرانی قرآن کا ایک قلمی نسخہ دیکھا ہے، تو انھوں نے ان سطروں کا فوٹو لے لیا، اس میں عربی سطروں کے اوپر ایرانی زبان میں اس کا ترجمہ ہے۔ اور جس طرح طبرسی نے اس کو اپنی کتاب ''فصل الخطاب في إثبات تحريف كتاب رب الأرباب'' میں اس کو ذکر کیا ہے، اسی طرح وہ محسن فانی کشمیری کی فارسی کتاب ''دبستان مذاہب'' میں بھی مذکور ہے، یہ کتاب ایران میں متعدد بار شائع ہوچکی ہے، اور اس سے اللہ کے نام پر گھڑی ہوئی اس سورۃ کو مستشرق عالم نولدکی نے اپنی کتاب ''تاریخ المصاحف'' میں جلد ۲ صفحہ ۱۰۲ پر نقل کیا ہے، اور اس کو فرنچ ایشیاٹک میگزین نے ۱۸۴۲ء میں صفحہ ۴۳۱-۴۳۹ پر ذکر کیا ہے۔

اس نجفی عالم نے جس طرح سورۂ ولایت سے قرآن کے محرف ہونے پر استدلال کیا ہے، اسی طرح کتاب ''الکافی'' طبع ایران ۱۲۷۸ھ صفحہ ۲۸۹ پر وارد عبارت سے بھی کیا ہے، اس کتاب کی حیثیت شیعوں کے نزدیک وہی ہے جو مسلمانوں کے نزدیک صحیح بخاری کی ہے، اس کتاب ''الکافی'' کے مذکورہ بالا صفحہ کا ترجمہ یہ ہے:

''ہمارے متعدد ساتھیوں نے سہل بن زیاد سے روایت کیا ہے، سہل نے محمد بن سلیمان سے، محمد نے اپنے بعض ساتھیوں سے، انھوں نے ابوالحسن علیہ السلام سے (یعنی ابوالحسن ثانی علی بن موسی رضا متوفی ۲۰۶ھ) انھوں نے کہا کہ میری جان آپ پر قربان ہو، بیشک ہم قرآن میں کچھ آیتیں سنتے ہیں، جو ہمارے ہاں اس طرح نہیں ہیں جس طرح ہم سنتے ہیں، جس طرح آپ سے ہم کو قرآن ملا ہے اس طرح ہم اس کو اچھی طرح پڑھ نہیں سکتے، تو کیا ہم گناہگار ہوں گے؟ انھوں نے کہا کہ نہیں، جس طرح تم نے سیکھا ہے اسی طرح پڑھو، عنقریب وہ آئے گا جو تم کو سکھائے گا''۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اس کلام کو شیعوں نے اپنے امام علی بن موسی رضا کے نام پر گھڑ لیا ہے۔ مگر اس کا مطلب ان کے نزدیک یہ ہے کہ وہ اس بات کا فتویٰ ہے کہ جو شخص قرآن اس طرح پڑھے جس طرح لوگ مصحف عثمانی میں سیکھتے ہیں، تو وہ گنہ گار نہیں ہوگا، پھر شیعوں میں سے کچھ خاص لوگ ایک دوسرے کو وہ قرآن سکھائیں گے جو اس کے خلاف ہے، جس کے بارے میں شیعوں کا یہ خیال ہے کہ اہل بیت کے ان کے اماموں کے پاس موجود ہے، یا موجود تھا۔

(جاری ہے)

مدینہ منورہ کے فضائل ''صحیح بخاری میں''

تحریر: جمال الدین محمد بن احمد المطری ترجمہ: مولانا انور رشید الاعظمی استاذ مرقاۃ العلوم، مئو

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ''مجھے ایک ایسی بستی کی طرف ہجرت'' کا حکم دیا گیا جو تمام بستیوں پر غالب رہتی ہے اس بستی کو یثرِب کہتے ہیں اور (اب) وہ مدینہ ہے جو (برے) آدمیوں کو اس طرح نکال دیتا ہے جس طرح بھٹی لوہے کے میل کچیل کو نکال دیتی ہے (بخاری)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ ''ہمارے پاس کتاب اللہ (قرآن) اور اس صحیفہ کے علاوہ اور کچھ نہیں'' رسول کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی بھی نقل کرتے ہیں کہ ''مدینہ'' عیر سے یہاں تک، ایک دوسری روایت میں عیر اور ثور کے درمیان حرم ہے، لہذا جو شخص مدینہ میں بدعت پیدا کرے (ایسی بات کہے یا رائج کرے جو قرآن وحدیث کے خلاف ہو) یا کسی بدعتی کو پناہ دے تو اس پر خدا کی، فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت ہے، اس شخص کے نہ تو (کامل طور پر) فرض (اعمال) قبول کیے جاتے ہیں نہ نفل۔

ابوحمید کہتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ تبوک [1] سے واپس آئے، جب ہم مدینہ کے قریب پہنچے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ طابہ ہے، حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایمان مدینہ کی طرف اسی طرح سمٹ کر آ جائے گا جس طرح سانپ اپنے بل میں سمٹ کر آ جاتا ہے، حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے سنا رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے، جب یمن فتح ہو جائے گا تو ایک ایسا گروہ آئے گا جو آہستہ رَو ہوگا (یعنی کچھ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو محنت ومشقت سے دور رہ کر دنیا کی راحت وآرام کے طالب ہوں گے) چنانچہ وہ لوگ اپنے اہل وعیال کے ساتھ

(۱) تبوک اس وقت ایک بڑا مشہور شہر ہے غزوۂ تبوک کی شہرت اسی کی نسبت سے ہے مدینہ منورہ سے جانب شمال ۷۰۲ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے

مدینہ سے چلے جائیں گے حالانکہ مدینہ ان کے لیے بہتر جگہ ہوگی اگر وہ (مدینہ کے بہتر ہونے کو) جانیں (تو مدینہ کو نہ چھوڑیں) جب شام فتح ہوگا تو ایک گروہ آئے گا جو آہستہ رَو ہوگا، چنانچہ وہ لوگ اپنے اہل وعیال کے ساتھ مدینہ سے چلے جائیں گے حالانکہ مدینہ ان کے لیے بہتر جگہ ہوگی اگر وہ جانیں، اسی طرح جب عراق فتح ہوگا تو ایک گروہ آئے گا جو آہستہ رَو ہوگا چنانچہ وہ لوگ اپنے اہل وعیال کو لے کر مدینہ سے چلے جائیں گے حالانکہ مدینہ ان کے لیے بہتر جگہ ہوگی اگر وہ جانیں (تو مدینہ کو نہ چھوڑیں) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ مدینہ کے دونوں پہاڑوں کے کناروں کے درمیان کو میری زبان سے حرام (باعظمت) قرار دیا گیا، (میں باعظمت قرار دیتا ہوں)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنی حارثہ کے پاس تشریف لائے اور ارشاد فرمایا کہ بنی حارثہ میں تمہیں دیکھ رہا ہوں کہ تم حرم سے نکل گئے، پھر آپ نے ارشاد فرمایا کہ نہیں بلکہ تم لوگ اسی میں ہو۔

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مدینہ میں کانے دجّال کا خوف (بھی) داخل نہیں ہوگا،، اس دن (جب کہ کانا دجال نمودار ہوگا) مدینہ کے سات دروازے (یعنی سات راستے) ہوں گے، اور ہر دروازہ (یعنی ہر راستہ) پر دو فرشتے (مدینہ کی حفاظت پر مامور) ہوں گے، (بخاری)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مکہ اور مدینہ کے علاوہ ایسا کوئی شہر نہیں ہے جسے دجّال نہ روندے گا اور مکہ و مدینہ کے راستوں میں ایسا کوئی راستہ نہیں ہے جس پر صف باندھے ہوئے فرشتے نہ کھڑے ہوں جو اس شہر کی نگہبانی کرتے ہیں، پھر مدینہ اپنے باشندوں ں کے ساتھ (زلزلہ کی صورت میں) تین مرتبہ ہلے گا جس کے نتیجہ میں ہر کافر ومنافق مدینہ سے نکل پڑے گا، اور دجّال کے پاس چلا جائے گا (بخاری)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے دجّال کے بارے میں ایک حدیث بیان فرمائی اور وہ بڑی لمبی حدیث تھی، اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ دجّال مدینہ میں آئے گا اور مدینہ کے راستوں میں داخل ہونا اس پر حرام ہوگا، تو دجّال مدینہ کے باہر بعض شور زمین میں نمودار ہوگا، تو اس دن دجّال کے پاس ایک ایسا شخص آئے گا جو

لوگوں میں سب سے نیک شخص ہوگا، اور وہ کہے گا کہ میں یہ گواہی دیتا ہوں کہ تو ہی وہ دجّال ہے جس کے بارے میں رسول اکرم ﷺ نے ہم سے بیان کیا ہے، تو دجّال کہے گا بتاؤ اگر اس آدمی کو میں قتل کردوں پھر اس کو زندہ کروں تو کیا تم لوگ اس معاملہ میں شک وشبہہ کروگے، تو لوگ جواب میں کہیں گے کہ نہیں، اس کے بعد وہ اس کو قتل کرے گا پھر زندہ کرے گا، تو جس وقت دجّال اس کو زندہ کرے گا تو وہ شخص کہے گا کہ بخدا آج مجھے جس قدر بصیرت حاصل ہے اتنی تو کبھی میرے اندر بصیرت نہیں تھی، پھر دجّال کہے گا کہ ذرا اس کو قتل کروں مگر اس کو اس پر قابو نہ حاصل ہوگا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نبیٔ کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے (بطور دعا) فرمایا اے اللہ مدینہ کو اس برکت سے دوگنی برکت عطا فرما جو تو نے مکہ کو عطا کی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ جب کسی سفر سے واپس تشریف لاتے تو مدینہ منورہ کی دیواریں (یعنی اس کی عمارتیں) دیکھ کر اپنے اونٹ کو دوڑانے لگتے اور اگر گھوڑے یا خچر پر سوار ہوتے تو اس کو تیز کر دیتے، اور یہ اس وجہ سے تھا کہ آپ کو مدینہ سے محبت تھی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نقل کرتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ (اور صحابہ) جب (مکہ سے ہجرت کرکے) مدینہ تشریف لائے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ بخار میں مبتلا ہوگئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جب بخار چڑھتا تو یہ شعر پڑھتے:

كل امرئٍ مصبَّح في أهله   والموت أدنى من شراك نعله

ہر شخص اپنے گھر والوں میں صبح کرتا ہے، جب کہ موت اس سے اس کے جوتے کے تسمے سے بھی زیادہ قریب ہے، اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا جب بخار اترتا تو بلند آواز سے یہ اشعار پڑھتے:

الا ليت شعري هل ابيتنّ ليلة   بوادٍ وحولي إذخرو [1] جليل

وهل أردن يوماً مياهَ مجنة   وهل يبدون لي شامة وطفيل

کاش مجھے اس بات کا علم ہوتا کہ کوئی رات میں ایک ایسی وادی میں گذاروں گا کہ میرے آس پاس اذخر اور جلیل ہو۔

اور یہ بات بھی مجھے معلوم ہوتی کہ کسی دن میں مجنہ کے پانی پر آؤں گا اور شامہ اور طفیل

(۱) اذخر ایک قسم کی گھاس ہے اس کے سفید پھول ہوتے ہیں، عمدہ خوشبو ہوتی ہے، دوا میں استعمال کی جاتی ہے، حجاز میں بکثرت ہوتی ہے، جلیل بھی ایک گھاس ہے تکیہ کے اندر اس کو ڈالا جاتا ہے۔

(پہاڑوں کے نام ہیں میرے سامنے ظاہر ہوں گے (پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے دعا کی) اے اللہ شیبہ بن ربیعہ اور عتبہ بن ربیعہ اور امیہ بن خلف [1] پر لعنت ہو جس طرح انھوں نے ہم کو ہماری سرزمین سے نکالا ہے اور ہمیں وبائی زمین میں پہنچا دیا، پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی **اللّٰھمَّ حبب الینا المدینة کحبنا مکة أو أشدّ، اللھم بارک لنا فی صاعنا وفي مدّنا وصححھا لنا وانقل حمّاھا إلی الجحفة،** اے اللہ تو مدینہ کو ہمارا محبوب بنا دے جس طرح تو نے مکہ کو ہمارا محبوب بنایا تھا، بلکہ اس سے بھی زیادہ، اور ہمارے صاع اور مدّ میں ہمارے لیے برکت عطا فرما، اور اس کی آب وہوا کو درست فرما دے، اور مدینہ کے بخار کو (یعنی بخار کی کثرت و وبا کو) یہاں سے نکال کر جحفہ [2] میں منتقل کر دے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں اور جب ہم مدینہ آئے تو مدینہ سب سے زیادہ وبائی مرض والا شہر تھا، اور فرماتی ہیں کہ بطحان (مدینہ کی ایک مشہور وادی) اس طرح جاری رہتی تھی کہ اس کے پانی کی لذت اور اس کی بو دونوں کے اندر تغیر تھا۔

''مدینہ کے فضائل'' صحیح مسلم میں

حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ مکرمہ کو حرم قرار دیا (یعنی انھوں نے مکہ کی بزرگی اور حرمت کو ظاہر کیا) اور اہل مکہ کے حق میں دعا کی، اور میں نے مدینہ کو بزرگی دی جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو عظیم قرار دیا، اور میں نے مدینہ کے صاع اور مد میں اس برکت سے دوگنا برکت کی دعا کی جس کی ابراہیم نے مکہ کے حق میں دعا کی تھی۔

حضرت نافع بن جبیر کہتے ہیں کہ مروان بن حکم نے لوگوں کے سامنے خطبہ دیا تو مکہ اور اہل مکہ اور مکہ کی حرمت و بزرگی کا تذکرہ کیا (اور مدینہ، اہل مدینہ اور مدینہ کی حرمت اور بزرگی کا کوئی تذکرہ نہیں کیا) تو رافع بن خدیج نے انھیں آواز دی اور کہا کہ کیا بات ہے کہ میں تمھیں سن رہا ہوں کہ تم مکہ اور مکہ کی عظمت وحرمت کا تو تذکرہ کرتے ہو اور مدینہ کی عظمت وحرمت اور اہل مدینہ کا ذکر نہیں

---

(۱) یہ تینوں قریش کے لیڈر اور مشرکین مکہ کے سردار تھے، مکہ میں ان کا رعب اور دبدبہ تھا، مسلمانوں کے حق میں بڑے سخت تھے، ان کو سزئیں دیتے تھے، جن مسلمانوں کو تکلیفیں دیا کرتے تھے ان میں سرفہرست حضرت بلال رضی اللہ عنہ تھے، مسلمانوں کو ان کے وطن سے نکالنے میں بڑے سخت تھے، تینوں غزوۂ بدر ۲ھ میں مقتول ہوئے۔

(۲) جحفہ یہ اہل شام ومصر کی مشہور میقات ہے، وہ قدیم بستی ہے جس کا قدیم نام مہیعہ ہے زبردست سیلاب کے سبب وہ مکمل طور پر برباد ہو گیا تو اس کا نام جحفہ ہو گیا اور اب تک وہی نام ہے، رابغ شہر سے قریب ہے۔

کرتے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کے دونوں پہاڑوں کے کناروں کے درمیان کو باعظمت قرار دیا ہے اور یہ بات ہمارے پاس ادیم خولانی (۱) میں لکھی ہوئی ہے اگر تم چاہو تو میں تمہیں پڑھنے کے لیے دے سکتا ہوں، راوی کہتے ہیں کہ مروان خاموش رہا اور پھر کہا کہ ہاں اس کی کچھ باتیں میں نے بھی سن رکھی ہیں۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں مدینہ کے دونوں پہاڑوں کے کناروں کے درمیان کو حرام (باعظمت) قرار دیتا ہوں، لہذا نہ تو اس زمین کے خاردار درخت کاٹے جائیں اور نہ اس میں شکار مارا جائے، اور فرمایا کہ مدینہ ان لوگوں کے لیے (جو مدینہ میں رہتے ہیں) بہتر ہے بشرطیکہ وہ اس بات کو جانیں، جو شخص بھی اس کو بے رغبتی کے ساتھ (بلا ضرورت) چھوڑے گا تو اللہ تعالی اس کی جگہ کسی دوسرے ایسے شخص کو آباد کرے گا جو اس سے بہتر ہوگا، اور جو بھی شخص مدینہ میں سختیوں اور بھوک پر ثابت قدم رہے گا، تو میں قیامت کے دن اس کی شفاعت کروں گا، یا یہ فرمایا کہ میں اس کی اطاعت کا گواہ بنوں گا۔

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ رسول کریم ﷺ سے مذکورہ بالا حدیث نقل کرتے ہوئے یہ اضافہ کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص اہل مدینہ کے ساتھ کسی برائی کا (کسی طرح کی تکلیف وغیرہ کا) ارادہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ جہنم میں اس طرح پگھلائے گا جس طرح سیسہ پگھلایا جاتا ہے، یا آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس طرح پانی کے اندر نمک پگھل جاتا ہے، (اس طرح اس کو پگھلائے گا)

حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، کہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے اپنے مبارک ہاتھ سے مدینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: مدینہ پُرامن (باعظمت) حرم ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم لوگ جس وقت مدینہ آئے تو وہ وبائی شہر تھا، ابوبکر و بلال رضی اللہ عنہما بیمار پڑ گئے، تو رسول اکرم ﷺ نے جب صحابۂ کرامؓ کی بیماری دیکھی تو آپ ﷺ نے بطور دعا فرمایا، اے اللہ تو مدینہ کو ہمارا محبوب بنا دے، جس طرح تو نے مکہ کو ہمارا محبوب بنایا تھا، بلکہ اس سے بھی زیادہ، اور اس کی آب و ہوا کو درست فرما دے، اور اس کے صاع اور مد میں ہمارے لیے برکت عطا

(۱) ادیم: دباغت دی ہوئی کھال، اور خولانی خولان کی طرف منسوب ہے جو یمن کا ایک صوبہ ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس وقت نبی کریم ﷺ سے سنتے ہی حدیث لکھنے کا اہتمام تھا، اور یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ یمن سے بعض سامان مدینہ لائے جاتے تھے، کھالیں بھی لائی جاتی تھیں۔

فرما، اور مدینہ کے بخار (یعنی بخار کی کثرت و وبا کو) یہاں سے نکال کر جحفہ میں منتقل فرما۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ مدینہ کے راستوں پر فرشتے (حفاظت پر مامور) ہوں گے مدینہ میں نہ طاعون کا مرض پیدا ہوگا اور نہ ہی دجّال داخل ہو سکے گا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ کانا دجّال مشرق سے آئے گا اور مدینہ کا قصد کرے گا، یہاں تک کہ وہ احد پہاڑ کے پیچھے اترے گا، پھر فرشتے شام کی جانب اس کا رخ پھیر دیں گے، اور وہ ملک شام میں ہلاک ہو جائے گا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے ایک ایسی بستی کی طرف (ہجرت) کا حکم دیا گیا جو تمام بستیوں پر غالب رہتی ہے اور اس بستی کو یثرب کہتے ہیں اور اب وہ مدینہ ہے، جو (برے) آدمیوں کو اس طرح نکال دیتا ہے جس طرح بھٹی لوہے کے میل کچیل کو نکال دیتی ہے۔

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے نقل ہے کہتے ہیں کہ میں نے سنا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مدینہ کا نام طابہ رکھا ہے۔

حضرت ابوعبداللہ قرّاظ کہتے ہیں کہ میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے حق میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ انھوں نے فرمایا کہ ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص اس شہر یعنی مدینہ میں رہنے والوں کے ساتھ کسی برائی (ایذا پہنچانے کا) ارادہ کرے گا، تو اللہ تعالیٰ اس کو اس طرح پگھلائے گا جس طرح نمک پانی کے اندر پگھل جاتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل ہے کہتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ''جو شخص مدینہ کی سختی اور بھوک پر صبر کرے گا تو میں قیامت کے دن اس کی شفاعت کروں گا یا یہ فرمایا کہ میں اس کی اطاعت کا گواہ رہوں گا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ لوگوں کا معمول تھا کہ جب وہ کوئی نیا پھل دیکھتے تو اس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لاتے اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس پھل کو تناول کرتے تو فرماتے اے اللہ ہمارے پھلوں میں برکت عطا فرما، ہمارے شہر میں برکت عطا فرما، ہمارے صاع میں برکت عطا فرما،

(صاع ایک پیمانہ کا نام ہے) ہمارے مُد میں برکت عطا فرما، (مُد بھی ایک پیمانہ کا نام ہے) اور اے اللہ ابراہیم علیہ السلام تیرے بندہ تھے، تیرے خاص دوست تھے، اور تیرے نبی تھے، اور میں بھی تیرا بندہ ہوں اور تیرا نبی ہوں، ابراہیم علیہ السلام نے تجھ سے مکہ کے لیے دعا مانگی تھی، اور میں مدینہ کے لیے دعا مانگتا ہوں، اسی طرح کی جو ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کے لیے مانگی تھی، بلکہ اس کی مانند اور بھی دعا (یعنی ابراہیم علیہ السلام کی دعا سے دو چند مانگتا ہوں) پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خاندان کے سب سے چھوٹے بچہ کو بلاتے اور اس کو وہ پھل عنایت فرماتے (بچہ کو خوش کرنے کے لیے)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پہلا پھل لاتے تو فرماتے اے اللہ ہمارے شہر میں برکت عطا فرما، اور ہمارے پھلوں میں برکت عطا فرما، ہمارے مُد میں برلت عطا فرما، ہمارے صاع میں برکت ہی برکت عطا فرما، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس پھل کو وہاں کے سب سے چھوٹے بچہ کو عنایت فرماتے، حضرت اسلم بن زید اپنے والد زید سے اللہ تعالیٰ کے قول ''وَقُلْ رَّبِّ أَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَلْ لِيْ مِنْ لَّدُنْکَ سُلْطَاناً نَصِيْراً'' کے بارے میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مدینہ کو مُدْخَلَ صِدْقٍ (اچھائی کے ساتھ داخل ہونے کی جگہ) اور مکہ کو مُخْرَجَ صِدْقٍ (خوبصورتی کے ساتھ نکلنے کی جگہ) اور انصار کو سلطان نصیر (فتح ونصرت والا غلبہ) قرار دیا ہے۔

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مدینہ میری ہجرت کا مقام ہے، مدینہ ہی میں میری خوابگاہ ہوگی اور وہیں سے دوبارہ مجھے اٹھایا جائے گا۔ میرے پڑوس کے لوگ جب تک گناہ کبیرہ سے بچتے رہیں تو میری امت کی ذمہ داری ہے کہ ان کی حفاظت کریں اور جو شخص ان کی حفاظت کرتا رہے گا تو میں قیامت کے دن اس کے لیے گواہی دوں گا، یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کی شفاعت کروں گا، اور جو شخص ان کی حفاظت نہیں کرے گا اس کو طینۂ خبال پلایا جائے گا، مُزنی سے سوال کیا گیا کہ طینۂ خبال کیا چیز ہے انھوں نے کہا کہ اہل جہنم کے (زخموں سے نچوڑا ہوا مادہ) پیپ وغیرہ۔

حضرت قیس بن شماس رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مدینہ کی مٹی میں کوڑھ کی بیماری سے شفا ہے۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ سارے شہر تلوار کے ذریعہ فتح ہوئے ہیں اور مدینہ قرآن کے ذریعہ فتح ہوا ہے۔

حضرت یحییٰ بن سعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (مجھ تک یہ حدیث پہنچی ہے کہ ایک دن) مدینہ میں ایک قبر کھودی جا رہی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہاں تشریف فرما تھے، ایک شخص نے قبر میں جھانکا اور کہنے لگا کہ (یہ قبر) مومن کے لیے بری خوابگاہ ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (یہ سن کر) فرمایا کہ بُری تو وہ چیز ہے جو تم نے کہی ہے، اس شخص نے عرض کیا کہ میرا یہ منشاء نہیں تھا، بلکہ اس سے میرا مطلب اللہ کی راہ میں شہید ہونے (کی فضیلت) کو ظاہر کرنا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (ہاں) اللہ کی راہ میں شہید ہونے سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے، لیکن (یہ بات بھی ہے کہ) روئے زمین کا کوئی بھی ٹکڑا ایسا نہیں ہے جس میں میری قبر بنے اور وہ مدینہ سے زیادہ محبوب ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات تین مرتبہ فرمائی۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مدینہ کے حالات بڑے سخت ہو گئے اور چیزیں گراں ہو گئیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مدینہ والو صبر کرو اور خوش خبری سن لو کہ میں نے تمھارے صاع اور تمھارے مُد میں برکت کی دعا کی ہے، سب لوگ اکٹھا ہو کر کھاؤ اور علیٰحدگی نہ اختیار کرو، یقین جانو ایک شخص کا کھانا دو آدمیوں کو کفایت کرے گا، جو شخص بھی مدینہ کی بھوک اور اس کی سختی و تکلیف پر صبر کرے گا تو میں قیامت کے دن اس کی شفاعت کروں گا اور اس کا گواہ بنوں گا، اور جو شخص بھی بے رغبتی کے ساتھ اس شہر سے نکل جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ ایسے شخص کو اس میں مقیم کرے گا جو اس سے بہتر ہوگا، اور جو شخص اس میں ظلم کرے گا یا کسی برائی کے قریب ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس کو اس طرح پگھلا دے گا جس طرح نمک پانی میں پگھل جاتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے، یہاں تک کہ جب ہم حرہ[1] سقیا میں تھے جو سعد بن ابی وقاص کا تھا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وضو کا پانی لاؤ، جب آپ وضو سے فارغ ہوئے تو کھڑے ہوئے اور قبلہ کی طرف رخ انور کر کے تکبیر پڑھی،، پھر یہ دعا مانگی، اے اللہ ابراہیم علیہ السلام آپ کے بندے اور آپ کے خلیل ہیں، انھوں نے مکہ والوں کے لیے خیر

(۱) مدینہ منورہ کا ایک مشہور کنواں، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے ہے، اس وقت وہ باب عنبریہ میں واقع ہے، اس کا ذکر انشاء اللہ کنویں کے بیان میں آئے گا۔

وبرکت کی دعا مانگی، اور میں محمد تیرا بندہ اور رسول ہوں، میں تجھ سے مدینہ والوں کے لیے یہ دعا کرتا ہوں کہ ان کے مُد اور صاع میں برکت عطا فرما، جیسی برکت مکہ والوں کے لیے عطا فرمائی ہے، بلکہ اس کے دوگنا برکت عطا فرما۔

حضرت ابراہیم بن یحییٰ کہتے ہیں کہ توراۃ میں مدینہ کے گیارہ نام ہیں، مدینہ، طیبہ، طابہ، مسکینہ، جابرہ، مجبورہ، مرحومہ، ہذراء، محبہ، محبوبہ، قاصمہ۔

حضرت کعب احبار رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم اللہ کی کتاب میں جو موسیٰ علیہ السلام پر اتاری گئی ہے یہ بات پاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مدینہ سے فرمایا کہ اے طیبہ، اے طابہ، اے مسکینہ، خزانوں کو قبول نہ کرنا میں دوسری بستیوں کی چھتوں سے تمھاری چھت کو اونچا کردوں گا، عبدالعزیز بن محمد کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ توریت میں مدینہ کے ۴۰ نام مذکور ہیں۔

مصنف کہتے ہیں کہ علماء نے مدینہ کو یثرب کہنے سے جو منع فرمایا ہے تو اس کا سبب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ لوگ مدینہ کو یثرب کہتے ہیں حالانکہ وہ مدینہ ہے، اور کراہت کا سبب مسند احمد کی وہ روایت بھی ہے جس میں امام احمد حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے مدینہ کو یثرب کے نام سے پکارا تو اس کو اللہ سے استغفار کرنا چاہئے، وہ طابہ ہے وہ طابہ ہے، اور قرآن میں مدینہ کا یثرب کے نام سے جو تذکرہ ہے تو وہ بعض منافقین وغیرہ کی بات کے نقل کے ضمن میں آیا ہے، (**یاأهل یثرب لا مقام لکم فارجعوا**)

عیسیٰ بن دینار کہتے ہیں کہ جس نے مدینہ کو یثرب کے لفظ سے یاد کیا تو اس پر ایک گناہ لکھ دیا گیا، لفظ یثرب کا مادہ ثرب ہے جس کے معنی فساد اور بگاڑ کے ہیں، یا وہ تثریب سے ماخوذ ہے اور تثریب کا معنی گناہوں پر مواخذہ ہے، اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم بہتر ناموں کو پسند فرماتے تھے اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کا طیبہ اور طابہ نام رکھا ہے، کیونکہ لفظ طیبہ میں خوشبو اور پاکیزگی ہے اور یہ چیز مدینہ منورہ کے اندر موجود ہے لوگوں کا بیان ہے کہ یہ چیز مدینہ منورہ کی ہوا میں اور اس کی مٹی میں بلکہ اس کی تمام چیزوں میں موجود ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ طیبہ نام رکھنے کی وجہ اللہ تعالیٰ کے قول ''بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ'' سے موافقت ہے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ طیبہ نام اس لیے رکھا گیا کہ وہ کفر سے پاک وصاف ہے اور ان کا مستدل آیت کریمہ ''وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ'' ہے۔ اور طیب اور طاب دونوں ہم معنی ہیں، ابوعبیدہ

معمر بن مثنی کہتے ہیں کہ یثرب زمین کا نام ہے اور مدینۃ النبی اس کے ایک حصہ میں ہے۔
مصنف کہتے ہیں کہ وہ آج اسی نام (یثرب) سے مشہور ہے، اس میں کھجور کے بہت سارے درخت ہیں جو اہل مدینہ کی ملکیت ہیں اور وہاں کے فقراء و مساکین پر وقف ہیں، اور وہ رسول اکرم ﷺ کے چچا حضرت ابو عمارہ حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کے مشہد مبارک کے مغربی جانب اور اس مقام کے مشرقی جانب میں واقع ہے جو بر کہ کے نام سے مشہور ہے، جو ازرق چشمہ کی نالی ہے جس کے پاس شامی قافلے دوران سفر قیام کرتے ہیں، اور حجاج اس کو عیون حمزہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔
اور قبیلۂ اوس کی ایک بڑی شاخ بنی حارثہ بن الحارث کے مکانات بھی یثرب کہلاتے تھے، اور ابن زبالہ کہتے ہیں کہ زمانۂ قدیم میں حتی کہ اوس وخزرج کے قیام سے پہلے یثرب مدینہ کی سب سے بڑی بستی تھی، اور عمالقہ کے بعد مدینہ پر غلبہ حاصل کرنے والے یہودیوں کی بڑی تعداد اسی بستی میں مقیم تھی، ابن زبالہ سے یہ بات بھی منقول ہے کہ اس بستی میں تین سو یہودی زرگر مقیم تھے، واللہ اعلم، اور غزوۂ احزاب کے موقع پر بنی حارثہ ہی کے بارے میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی ہے ''وَاِذْ قَالَتْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ يَا اَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا'' اور غزوۂ احد کے موقع پر انھیں (بنی حارثہ) کے بارے میں اور قبیلۂ خزرج کی شاخ بنی سلمہ کے بارے میں یہ فرمان الٰہی نازل ہوا ''إذ همت طائفتان منكم أن تفشلا والله وليهما ''جس پر ان کے عقلاء اور اصحاب رائے نے یہ کہا کہ ہمیں اس آیت کے نزول پر اس لئے کوئی ناگواری نہیں کہ اللہ رب العزت ہمارا سرپرست ومحافظ ہے اور اس کا بڑا احسان ہے کیونکہ غزوۂ احزاب اور غزوۂ احد کے موقع پر قریش کے مکانات اور کنانہ کے جو لوگ ان کے ساتھ تھے ان کے مکانات، اور ان کے علاوہ اسد وغطفان کے مکانات بنی سلمہ اور بنی حارثہ کے مکانات کے درمیان وادی عقیق کے نشیبی علاقہ میں جو ایک کشادہ جگہ ہے، واقع تھے، اور دونوں گروہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ مقام جنگ میں تھے اور دشمن کی طرف سے اپنے اہل وعیال اور وطن کے بارے میں خائف تھے، تو اللہ تعالیٰ نے ہمارے سردار رسول اکرم ﷺ کی صحبت کی برکت سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اخلاص نیت کے صلہ میں اس مصیبت کو ٹال دیا، مدینہ منورہ کے سلسلہ میں جو فضائل میں نے یہاں ذکر کیے ہیں، صحاح وغیرہ میں اس سے بہت زیادہ مذکور ہیں۔
(جاری ہے)

رسائل خاندان ولی اللہی
اوران کی اشاعت میں حضرت محدث الاعظمیؒ کی دلچسپی

از: مسعود احمد الاعظمی

اسرار المحبۃ

یہ اپنی نوعیت کا نادر اور منفرد رسالہ ہے، محبت کے موضوع پر اس تفصیل اور اس کی انواع واقسام اور شعبوں کا اس طرح تجزیہ کر کے ابھی تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی، اس کتاب کو علم النفس -نفسیات- کی کتاب سمجھنا چاہیے، جس کے بارے میں مولانا ڈاکٹر محمد شفیع لاہوری نے دائرۂ معارف اسلامیہ میں لکھا ہے کہ:

”بعض نئے نکات ومعارف پر مشتمل ہے اور اس میں تجزیہ نفس کے عناصر بھی شامل ہیں“(۱)۔

اصل کتاب کے تین اجزا ہیں: ۱-تحصیل، ۲-تذئیل، ۳-تفصیل۔

تحصیل:

جزءاول یعنی تحصیل کی ابتدا ان جملوں سے کی ہے:

الـذي نعتقده ونجزم به أنه لا ريب أن المحبة سر قدسي غيبي وشأن عظيم إلٰهي، كل ما يقال في الإنباء عن شأنه واستيفاءً لبيانه، فهو عن حقيقتها قاصر، وسعة سباسبها لسيل المدارک حاصر. وهي كسائر الصفات الإلٰهية من العلم والحيوة والقدرة مستوعبة الظهور للمظاهر بجملتها، وسارية ينبوعها في الأكوان برمتها(۲).

---

(۱) دائرۃ المعارف: ۱۰/۳۱۹

(۲) اسرار المحبۃ: ۲۵

اس میں محبت کی حقیقت، اوراس کی بہت سی اقسام اور شعبوں پر گفتگو کی ہے، مثلاً رحمت خداوندی، ولایت، ایمان، حصول نجات اور مراتب توحید وغیرہ سب کو محبت کا فیضان قرار دیا ہے۔ حضرت شاہ صاحب محبت کی ابتدائی تین قسمیں کرتے ہیں: محبت الٰہی؛ محبت بشری؛ اور محبت جامعہ۔ اول کو دو شعبوں میں تقسیم کرتے ہیں: محبت من اللہ؛ محبت مع اللہ۔ اسی طرح دوسری قسم کو بھی دو شعبوں میں تقسیم کرتے ہیں: محبت طبعیہ؛ محبت غرضیہ۔ اور تیسری کا صرف ایک شعبہ ہے جو دونوں سے مرکب ہے، اور یہ اللہ کے واسطے لوگوں کی باہمی محبت ہے۔

شعبۂ اولی: اس میں محبت ذاتیہ اور محبت اسمائیہ کی تحقیق کی ہے، اوراس شعبے میں دو نکتے بیان کیے ہیں۔ پہلے نکتے میں یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالی کی تربیت (مظہر ربوبیت) دو قسموں میں منقسم ہے:

تربیت ایجاد وامداد: جس کی نسبت قرآن کریم میں اللہ پاک نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿كُلًّا نُمِدُّ هٰؤُلَآءِ وَهٰؤُلَآءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ﴾ اور ﴿قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا﴾ اوراس محبت میں اللہ تعالی کی وہ نعمتیں ہیں، جن سے سعید وشقی اور مومن ومشرک دونوں متمتع ہوتے رہتے ہیں۔

تربیت ارشاد وارفاد: جس کی نسبت قرآن پاک میں ارشاد ہے: ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ اور ﴿الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ﴾ اور یہ محبت کا وہ مظہر ہے جس سے سعید اور خوش بخت لوگ ہی سرفراز اور شادکام ہوسکتے ہیں۔

اس دوسری قسم یعنی تربیت ارشاد کے تحت شاہ صاحب نے لکھا ہے:

ولها فروع غير محصورة بحسب استعدادات الأشخاص وسوانحهم، وهي معاملات شريفة تُستوفَى أصولُها للكاملين ويُكتفَى ببعضها لغيرهم، وتختلف جميعاً كما وكيفاً وتترقى بمرور الأوقات من حد إلى حد، بينهما كما بين السماء والأرض (۱).

اس کے بعد اس کی بہت سی فروع بیان کی ہیں۔

---

(۱) اسرار المحبۃ: ۳۰

دوسرے نکتے میں محبۃ اللہ مع العباد- اللہ پاک کی محبت بندوں کے ساتھ- پر گفتگو کی ہے، اور اس کے چار درجات قائم کر کے دو درجوں کا بطور خاص بیان کیا ہے۔ پہلا درجہ عام ہے جو "صوریہ مطلقہ" ہے؛ دوسرا خاص ہے جو "صوریہ منجزہ" ہے۔ پھر عامہ صوریہ مطلقہ کی تشریح یوں کی ہے:

بيان للأولى: أن كل حسنة وهي محبوبة مرضية له تعالى، ومن ثم لا يؤاخذ بها أحداً أثاب عليها أو لم يُثِبْ، كما أن كل سيئة مكروهة عنده تعالى لا يرحم بفعلها أحداً عاقب عليها أو لم يعاقب؛ فمن وُفِّق لشيء من الحسنات فقد استحقَّ منه سبحانه للإحسان وتعرَّض للرحمة والرضوان، واستعد لنعيم الآخرة ودخول الجنان، ولكن بشرط الختم على الإيمان والخروج عن عهدة ما ارتكب من العصيان(۱).

پہلے درجے کی توضیح یہ ہے کہ ہر نیکی اللہ کو محبوب اور پسندیدہ ہے، چنانچہ اسی وجہ سے اس نیکی پر وہ مواخذہ نہیں کرے گا، خواہ وہ ثواب عطا کرے یا نہ کرے، جس طرح ہر برائی خدا کے نزدیک ناپسندیدہ ہے، اس کی وجہ سے کسی پر رحم نہیں کرے گا، چاہے اس پر وہ عذاب دے یا نہ دے؛ لہذا جس شخص کو کسی نیکی کی توفیق ہو گئی، تو وہ خدائے پاک کے احسان اور اس کی رحمت ورضوان کا مستحق ہو جائے گا، اور آخرت کی نعمت اور دخول جنت کا سزاوار ہوگا، بشرطیکہ ایمان پر خاتمہ ہوا ہو اور نافرمانی کے ارتکاب سے عہدہ برآ رہا ہو۔

اور دوسرے درجے یعنی "خاصہ صوریہ منجزہ" کا بیان یوں فرمایا ہے:

وبيان الثانية: أن بعد الإيمان في الأعمال الصالحة ما يرضى به الرب تبارك وتعالى حتماً باتا من غير تعليق ولا تأجيل، وربما كانت تلك الأعمال موجبة لحسن الخاتمة حافظة لها كما وقع في أهل بدر: "اعمَلُوا ما شِئتُم فَقَد غَفرتُ لكم"، وفي أهل الحديبية: "لَن يَّلِجَ النارَ أحدٌ ممن بايَعَ تحتَ الشَّجرَةِ"، وفي أمير المؤمنين عثمان –رضي الله عنه–: "ما ضرَّ عثمانَ ما عمِلَ بعدَ هذا"(۲).

---

(۱) ایضاً: ۳۴-۳۳ (۲) اسرار المحبۃ: ۳۴

دوسرے درجے کی توضیح یہ ہے کہ ایمان کے بعد بعض اعمال صالحہ ایسے ہیں جن کے بارے میں بغیر کسی تعلیق وتاجیل کے معلوم ہے کہ ان کو حق تعالی کی خوشنودی حاصل ہے، اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ اعمال حسن خاتمہ کے موجب اور اس کے محافظ بن جاتے ہیں، جیسا کہ اہل بدر کی نسبت حدیث شریف میں وارد ہے: ’’**اعملوا ما شئتم فقد غفرت لكم**‘‘ (تم جو چاہے کرو تحقیق کہ میں نے تمھاری مغفرت کردی)، اور اہل حدیبیہ کے بارے میں ہے: ’’**لن يلِجَ النارَ أحدٌ ممن بايعَ تحتَ الشجرَة**‘‘ (درخت کے نیچے جن لوگوں نے بیعت کر لی ان میں سے کوئی دوزخ میں نہیں داخل ہوگا)، اور جیسا کہ امیر المؤمنین حضرت عثمان غنی –رضی اللہ عنہ– کے بارے میں حدیث میں آیا ہے: ’’**ما ضرَّ عثمانَ ما عملَ بعد هذا**‘‘ (اس کے بعد عثمانؓ کوئی بھی عمل کریں اس سے ان کو نقصان نہیں پہنچے گا)۔

اس کے بعد اس کی کچھ تفصیلات تحریر فرمائی ہیں، جو تقریباً تین صفحات پر مشتمل ہیں، اور ان کے مختلف شعبوں اور مراتب کا بیان ہے۔

شعبۂ ثانیہ: اس میں شاہ صاحبؒ نے مختلف نفوس پر محبت کے فیضان کو بیان کیا ہے، جس میں بیس جہات ذکر کی ہیں، اور ہر جہت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، ان جہات میں محبت کی کیفیت حدوث، نشو ونما، مراتب قوت وضعف، تربیت، محبت کی تبدیلیاں، اور عقل کے ساتھ محبت کی کشمکش اور ان کے علاوہ بہت سی کیفیات کو تفصیل سے بیان کیا ہے، اس ضمن میں بعض نہایت اہم اشکالات کو ذکر کرکے ان کا جواب بھی دیا ہے۔

شعبۂ ثالثہ: میں محبت طبعیہ کا بیان ہے، اس کی ابتدا میں شاہ صاحب لکھتے ہیں:

فمن أصول المتأصلة عندالخائضين والغائصين أن وجه الاتحاد بين الشيئين يُثمر الأنسة والايتلاف، وأن وجه الافتراق يُورث الوحشة والاختلاف، وبغلبة وجوه الاتحاد يزداد المحبة، وبغلبة جهات التفارق يزداد النفرة[1].

---

(۱) اسرار المحبۃ: ۴۸

یعنی محققین کے یہاں اس کی اصل اصول یہ ہے کہ دو چیزوں کے درمیان وجہ اتحاد اُنس والفت پیدا کرتی ہے، اور وجہ افتراق دوری اور اختلاف پیدا کرتی ہے، اور وجوہ اتحاد کے غلبہ سے محبت میں افزایش ہوتی ہے، اور جہات افتراق کے غلبے سے نفرت میں اضافہ ہوتا ہے۔

اس اصول پر شاہ صاحب نے کچھ اعتراض کرنے کے بعد اس محبت کے علی اختلاف المراتب بارہ اسباب بتلائے ہیں، اس کے بعد لکھا ہے کہ حسن کے چار مراتب ہوتے ہیں۔ اس کے بعد مناسبات کے پانچ اصول بیان کیے ہیں۔ ان اصول کے بیان کے بعد محبت کے مختلف مدارج اور کیفیات کے اعتبار سے اس کے ناموں کا شمار کرایا ہے، سب سے پہلا مرحلہ اُنس کا ہوتا ہے، پھر غرام، پھر حُب، پھر ایثار، پھر فدا، پھر ہویٰ، پھر دہش، پھر صَعق، پھر وداد، پھر مصافات، پھر خُلّۃ، پھر شوق، پھر صبابہ، پھر ولوع۔ اس کے بعد اور بھی کئی مدارج شاہ صاحب نے لکھے ہیں، اور ہر ایک کی تشریح بھی کی ہے، ولوع کی تشریح بیان کرتے ہوئے شاہ صاحب نے مجنوں اور بعض دوسرے شعراء عرب کے نہایت خوبصورت اشعار نقل کیے ہیں، ہم یہاں اس وجہ سے ان اشعار کو نقل کر دینا چاہتے ہیں، کہ ان سے شاہ صاحب کے اعلیٰ شعری ذوق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

أقول وقد أطلقتها من وثاقها فأنتِ لليلى ما حييتِ طليق

أيا شبه ليلى لا تُراعي فإنني لكِ اليوم من بين الأنام صديق

فعيناكِ عيناها وجيدكِ جيدها ولكنَّ عظم الساق منكِ دقيق

دوسرا شعر:

لثمتُ ثغر عَذولي حين سمَّاكِ بفيه حتى كأني لاثِمٌ فاكِ

تیسرا قطعہ:

أحِبُّ من أجلكم من كان يُشبِهكم حتى لقد صرتُ أهوى الشمس والقمرا

أمُرُّ بالحجر القاسي فأشمُّه فإنَّ قلبَك قاسٍ يُشبه الحجرا

محبت کی اس قسم یا اس شعبے کو بیان کرتے ہوئے شاہ صاحب اس کے جو نتائج بیان فرماتے ہیں، وہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، لکھتے ہیں:

وقد برهنتُ على أن العشق بهذا النوع أخبث الـفِتَن وأشنع المِحَن إلا لمن عصمه الله تعالى في ابتلائه، كما أنه بالنوع المذكور في الشعبة الثانية أشـرف الـنـعـم وأفضل المنن بأن لنا سبعة أشياء لا شيء يدانيها في عزتها وشرفها، كل منها لذة العيش وخلاصة الحياة، وهي: راحة القلب، وراحة البـدن، والـعـقـل، والـعـرض، والـمال، والشريعة، والطريقة، وهذا يُفسد الكل ويهدمه، ثم لا يَعقُبه غاية محمودة يَخلُفها[1].

میں ثابت کر چکا ہوں کہ اس قسم کا عشق بدترین فتنہ اور سخت ترین آزمائش ہے مگر جس کو اللہ تعالیٰ اس کی آزمائش میں محفوظ رکھے، جس طرح دوسرے شعبے میں مذکور قسمیں بلندترین انعامات اور بہترین احسانات ہیں، بایں طور کہ ہمارے پاس سات چیزیں ایسی ہیں کہ عزت وشرافت میں ان کے پاسنگ برابر بھی کوئی چیز نہیں ہے، اوران ساتوں میں سے ہر ایک لذت زیست، حاصلِ زندگی اور خلاصۂ حیات ہے، اور وہ یہ ہیں: راحت قلب، راحت بدن، عقل، آبرو، مال، شریعت اور طریقت۔ اور محبت کی یہ قسم ہر ایک کو بگاڑ اور برباد کر کے رکھ دیتی ہے، اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس کے بعد اس کا کوئی اچھا نتیجہ اور انجام بھی نہیں ظاہر ہوتا۔

اس کے بعد شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ اول الذکر پانچ چیزوں میں تو اس کی خرابی ظاہر ہے، ہاں شریعت وطریقت کے مسئلے میں یہ اتنی ظاہر نہیں ہے، تو اس کے بارے میں معلوم ہونا چاہئے کہ:

فأما الشـريـعة فـلأنَّ بـناء ها على الانقياد التام للشارع بنعت التوحيد والإخـلاص، والـمـعشـوقُ ربـمـا يأمر ويرضى بالمعصية، فإن أطاعه بطل الـديـنُ، وإن لم يُطعْه، فسد العشق؛ وأما الطريقة فلأن أصلها تخلية القلب عما سوى الله وهذا يضادُّه[2].

شرعی زندگی کو تو عشق اس طرح خراب کرتا ہے کہ شریعت کی بنیاد ہی توحید واخلاص کی صفت کے ساتھ شارع کی پوری طرح اطاعت وفرماں برداری ہے، اور معشوق کا حال یہ

(۱) اسرار المحبۃ: ۵۵ (۲) ایضاً

ہے کہ بسا اوقات وہ معصیت کا حکم دیتا ہے اور اسی میں اس کی خوشی ہوتی ہے، اب اگر عاشق معشوق کی بات مانتا ہے تو دین بگڑتا ہے، اور اگر اس کی بات نہ مانے تو عشق میں دراڑ پیدا ہوتی ہے؛ اور رہا مسئلہ طریقت کا تو اس کی اصل ہی ماسوی اللہ سے دل کو خالی رکھنا ہے اور عشق کا معاملہ اس کے یکسر برعکس ہے۔

پھر کچھ اور حکمتیں بیان کرنے کے بعد شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ اگر عشق میں پاکیزگی ہو، تو وہ کبھی دلِ خفتہ وبستہ کو برانگیختہ اور بیدار کر دیتا ہے، اور ایسے عاشق کی عنان اگر کسی شیخ کامل کے ہاتھ میں چلی جائے، تو وہ اس کی زندگی کا رخ بدل دیتا ہے، اور اس کی باطنی کیفیت کو اس طرح پروان چڑھاتا ہے کہ وہ عبادت وریاضت میں لذت محسوس کرنے لگتا ہے، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عشق میں ناکامی، پشیمانی اور مایوسی اس کے لیے توبہ کے دروازے کھول کر رکھ دیتی ہے۔

اس کے بعد شاہ صاحب نے صوت، غنا اور لحن وغیرہ کی قسموں اور ان کے اندر موجود تاثیر کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

شعبۂ رابعہ میں شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ انسان موجودات کی تمام قوتوں کا جامع ہے، خواہ وہ ارضی ہوں یا سماوی، فلکی ہوں یا عنصری، معدنی ہوں یا حیوانی یا مَلَکی مگر عقل کی وجہ سے انسان کو دوسرے موجودات پر یک گونہ فضیلت حاصل ہے۔ شاہ صاحب نے طبیعی اور غرضی کا فرق یوں بیان کیا ہے:

هذه الشعبة فرع ما قبلها، كما كانت الثانية شعبة لما قبلها؛ والفرق بين البشريتين أن ما يكون سبب المحبة معها أو قبلها، فطبيعية؛ وما كان بعدها، فغرضية[1].

یہ شعبہ اس پہلے والے شعبے کی فرع ہے، جس طرح دوسرا شعبہ پہلے والے شعبے کی فرع تھی؛ اور محبت بشریہ کے ان دونوں شعبوں میں فرق یہ ہے کہ طبیعیہ میں سببِ محبت اس کے ساتھ یا پہلے ہوتا ہے، اور غرضیہ میں محبت کے بعد ہوتا ہے۔

پھر شاہ صاحب نے حصول لذت کے لیے نفس کی کوشش، محبت کی اغراض مختلفہ ومتفرقہ کو ذرا

(۱) اسرار المحبۃ: ۶۱

تفصیل سے بیان کیا ہے۔

پانچواں شعبہ: اس میں شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ استفاضہ بقدر مناسبت ہوتا ہے، اور عام انسان کا احساس وادارک اس کے دائرۂ محسوسات سے باہر نہیں ہوتا، اور حق تعالی کی ذات اس کی رسائی عقل وادارک سے وراء الوراء ہوتی ہے، اس لیے اس کو ایک مرشد اور دلیل راہ کی ضرورت ہوتی ہے، جو حق تعالی تک اس کی رہنمائی کر سکے۔ اس شعبے میں مشاہدۂ حق کی گفتگو کے ساتھ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کو بھی ہلکے سے چھیڑا ہے، نیز فلسفۂ وحدۃ الوجود اور نصاری وہنود کے فلسفۂ حلول کے درمیان فرق کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ کاملین کے ساتھ محبت کے فوائد اور اثرات ونتائج بیان کرتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں:

وبهم تمَّت المناسبة مع الحق سبحانه في استفاضة الكمالات الظاهرة والباطنة، فوجب التوسُّل بهم في معرفة الحق، وسلوک سبيله، واقتناء رضائه، وبقدر المحبة يحصل الاتباع لهم، والانصباغ بهم، فيكمل الانتفاع، ويتم الاستمتاع، فصار حبهم أشرف الأغراض عقلاً وطبعاً كما كان كذلک شرعاً، وأجمعها للفوائد وأدومها في الدارين، الخ. (۱)

ان کاملین ہی کے ذریعے کمالات ظاہریہ وباطنیہ کے حصول میں حق تعالی کے ساتھ مناسبت کی تکمیل ہوتی ہے، لہذا حق کی معرفت، اس کے راستے کے سلوک، اس کی رضا کے حصول کے واسطے ان کو وسیلہ بنانا ضروری ہوتا ہے، اور محبت کے بقدر ہی ان کی پیروی ہوتی ہے، اور ان کا رنگ چڑھتا ہے، تب جا کر پورا پورا فائدہ اور نفع حاصل ہوتا ہے، لہذا ان کی محبت عقلاً وطبعاً بلندترین غرض ہے، جیسا کہ شرعاً بھی وہ بلندترین ہے، نیز تمام فوائد کی جامع اور دارین کے اندر دائم رہنے والی ہے۔

پھر اس شعبے کے بہت سے اصول، جزئیات اور کاملین کے مراتب کا بیان فرمایا ہے، متحابّین فی اللہ کی فضیلت، ''المرء مع من أحب'' کا مژدہ، حب فی اللہ اور تحابّ فی اللہ کا فرق اور اس طرح کے بہت سے دقیق اور باریک نکات پر گفتگو کی ہے، اللہ کے واسطے محبت کی فضیلت میں وارد بہت سی

(۱) اسرار الجنۃ: ۶۵

احادیث وروایات کو بھی ذکر کیا ہے اور معیت کا مفہوم نیز مراتب کا تفاوت اور فرق بھی بتلایا ہے۔اللہ کے ساتھ محبت، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ محبت، اہل بیتؓ اور صحابہ کرامؓ کے ساتھ محبت، صلحاء واولیاء کے ساتھ محبت اور اس سے مستفید ہونے کی شرائط کو شاہ صاحب نے نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے، بیعت وارشاد اور سلوک وتصوف کی حیثیت سے بھی یہ حصہ کتاب کی جان ہے۔

تذئیل:

اس حصے میں کتاب ہذا کی وجہ تالیف بیان کی ہے، اور خواجہ حسن مودودی لکھنوی -متوفی ۱۲۴۱ھ- کی وہ مراسلت ذکر کی ہے، جو انھوں نے حضرت شاہ صاحبؒ سے محبت کے مختلف نکات کو سمجھنے کے لیے کی تھی، اور جو اس رسالے کی تصنیف وتالیف کا باعث اور محرک بنی، شاہ صاحبؒ نے خواجہ صاحبؒ کا مکتوب بھی یہاں ذکر کر دیا ہے۔

اس میں بیان کیا گیا ہے کہ محبت کے کیا حقوق ہیں، اور طرفین کے لیے محبت کن شرائط کے ساتھ مفید ہوسکتی ہے، اور یہ بھی کہ کفار کو بھی اللہ تعالی شانہ کے ساتھ محبت ہوتی ہے، لیکن ان کی محبت میں نقص ہوتا ہے، جس کی وجہ سے عالم آخرت میں وہ محبت ان کے لیے مفید نہیں ہوسکتی، اس میں شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس نقص کی تفصیل بھی بیان فرمائی ہے۔

اسی طرح اہل ایمان میں جو ناقص محبت والے ہوتے ہیں، ان پر بھی آخرت میں محبت خداوندی کا ظہور اور رحمت خداوندی کا بیان فرمایا ہے۔

اس حصے میں شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنتُمْ﴾ کا مفہوم بیان کرنے کے ساتھ اس کا اور حدیث پاک "المَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ" کا فرق واضح کیا ہے۔

شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ محبت روحانیہ کا خاص حکم اطاعت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، لیکن اطاعت ضروری نہیں ہے کہ روحانی محبت کا نتیجہ ہو، کیونکہ ہر مطیع ومنقاد محبّ نہیں ہوتا، جیسا کہ ہر مطاع محبوب نہیں ہوتا، ہاں حالت اختیار اور مطاع کی لاعلمی میں اطاعت ظاہر ہوتی ہے، تو وہ محبت کی وجہ سے ہوگی۔ اس کے بعد شاہ صاحبؒ نے اطاعت کے بعض اسباب بیان فرمائے ہیں، اور آگے لکھا ہے کہ روحانی محبت ہی کا نتیجہ تھا کہ حضرت سلمان -رضی اللہ عنہ- کا شمار اہل بیت میں ہوگیا۔ آگے چل کر شاہ

صاحبؒ نے فرمایا ہے کہ جو شخص اولیاء اللہ کے ساتھ محبت کا دعویٰ کرتا ہے اور ان کے احوال وافعال کے قریب نہیں جاتا وہ دروغ گو اور جھوٹا ہے، پھر اس کی کچھ تفصیل بیان کرنے کے بعد محبت الٰہیہ کے خواص، اور اولیاء کرام کی صفات کو ذکر کیا ہے۔

تفصیل:

حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے اس حصے میں حصۂ اول یعنی ''تحصیل'' کی بعض مجمل اور مبہم باتوں کی تفصیل بیان کی ہے، نیز درجات محبت کی تفصیل ذکر کی ہے، اور یہ بیان کیا ہے کہ ادنیٰ درجہ محبت کا وہ ہے جو اعیانِ جمادیہ سے تعلق رکھتا ہے، اس کے بعد دوسرا درجہ شعور کے تابع ہے، تیسرا درجہ اعیان شاعرہ کے ساتھ، اور چوتھا درجہ حس کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، اور سالکین وواصلین کے مراتب کی تفصیل ہے۔

اس میں موت کے بعد باہم تجاذب کے شواہد اور ان کی شرح، اور پھر اس ضمن میں بعض عجیب وغریب اور حیرت انگیز واقعات وحکایات اور ان کے دقائق واسرار کو بیان کیا ہے۔

کتاب کے آخر میں نفس اور معرفۃ نفس سے متعلق کچھ قصائد ذکر کیے گئے ہیں، جن میں ایک قصیدہ الشیخ الرئیس ابوعلی بن سینا کا ہے، اس کے بعد اس کے جواب اور رد میں شاہ صاحبؒ کا ایک طویل قصیدہ ہے؛ اس کے بعد ایک قصیدہ بیسویں صدی کے امیر الشعراء احمد شوقی کا ہے، پھر شاہ صاحبؒ کے دو قصیدے اور ہیں، جن میں سے ایک شاہ رفیع الدین صاحب کا مخمس حقیقت نفس کے سلسلے میں اپنے والد کے کسی قصیدے پر ہے، اور دوسرا اور آخری معراج النبی ﷺ کے بیان میں قصیدہ ہے، اور یہی خاتمۂ کتاب ہے۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے کتاب کی اہمیت وافادیت اور اس کے مضامین کی نُدرت اور اچھوتے پن کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ اگرچہ ان سطروں میں کتاب کے تعارف کا ادنی سا حق بھی نہیں ادا کیا جا سکا ہے، لیکن ان سے کتاب کی قدر وقیمت کا اندازہ تو ضرور کیا جا سکتا ہے۔ اس اہم کتاب کو لائق اشاعت بنانے میں علامہ اعظمیؒ کا جو اہم حصہ اور رول رہا ہے، اس کو مولانا محمد بن موسیٰ میاں اور علامہ اعظمیؒ کی اس مراسلت سے سمجھا جا سکتا ہے، جو چند صفحات پہلے ذکر کی جا چکی ہے، ذیل میں 'اسرار المحبۃ' کے مقدمے سے - جو اس کے مصحح مولانا عبدالحمید سواتی کا تحریر کردہ ہے - کچھ اہم باتیں نقل کی

جارہی ہیں۔ مولانا موصوف نے اس کتاب کی نقول کے تعارف میں سب سے پہلے اسی کو ذکر کیا ہے، اور اس میں لکھا ہے:

''اس کتاب کی نقل ہم نے ''مجلس علمی کراچی'' کے نسخہ سے حاصل کی ہے، اور ''مجلس علمی'' نے اس کی نقل انڈیا سے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی دامت برکاتہم کے توسط سے حاصل کی ہے، چنانچہ حضرت مولانا نے ایک مکتوب میں اس کے بارہ میں یوں انکشاف فرمایا ہے:

''اسرار المحبۃ کی نقول بھی مجلس علمی کے پاس میری ہی بھیجی ہوئی ہیں، جس کو مجلس کے سرپرستوں کی خواہش پر میں نے نقل کرایا اور بھیجا ہے، 'اسرار المحبۃ' کے حاشیہ پر بھی جگہ جگہ میرے قلم سے تصحیحات ہیں، فرصت نہیں تھی ورنہ اس سے زیادہ مکمل تصحیح ہوگئی ہوتی''(۱)۔

اس کے بعد ہی مولانا سواتی لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا اعظمی کی ان تصحیحات سے بہت زیادہ فائدہ ہوا، لیکن پھر بھی بعض مقامات میں غلطیاں رہ گئی تھیں''(۲)۔

اس کے تقریباً ڈیڑھ صفحے بعد ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہوئے مولانا سواتی لکھتے ہیں:

''اسی طرح حضرت مولانا اعظمی دامت برکاتہم کے بھی ہم از حد ممنون ہیں، جن کی تصحیحات سے ہم نے فائدہ اٹھایا اور جو اپنے گرانقدر علمی مشوروں سے ہم جیسے کم علم لوگوں کو نوازتے ہیں اور حوصلہ افزائی فرماتے ہیں، ادام اللہ فیوضہم و برکاتہم''(۳)۔

اور آخر میں حاشیے کے اشارات و رموز کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اور جہاں حاشیہ میں ''مولانا اعظمی'' ہوگا، اس سے مراد سید الفقہاء تاج العلماء رئیس المحدثین و شیخ الحدیث حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی دامت برکاتہم .... کی ذات گرامی ہوگی''(۴)۔

---

(۱) مقدمہ اسرار المحبۃ: ۱۵ (۲) ایضاً: ۱۵
(۳) ایضاً: ۱۷ (۴) ایضاً: ۲۰

دمغ الباطل

مسئلہٴ وحدۃ الوجود کی بحث صدیوں سے ایک نہایت متنازَع فیہ بحث تھی، اوراس بحث میں علماءِ اسلام کے اختلافات بہت شدت اختیار کر گئے تھے، اگر چہ بقول مفتی محمد شفیع صاحب یہ ''کوئی تصوف کا مسئلہ ہی نہیں بلکہ مسئلہ کلامیہ ہے''؛(۱) لیکن درحقیقت یہ مسئلہ زیادہ اختلافی صورت میں خانقاہ کے گوشوں سے اٹھا اورنہایت اہم موضوع بحث بن گیا تھا، اوراس مسئلے میں اتنی شدت آئی کہ حضرت محی الدین ابن عربی جن کونظریہٴ وحدۃ الوجود کا موجداور بانی سمجھا جا تا تھا، ان کی ذات ہی بہت زیادہ مختلف فیہ ہوگئی۔ مسئلہٴ وحدۃ الوجود کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا عبدالحمید سواتی لکھتے ہیں:

''درحقیقت یہ صرف علم تصوف وسلوک وحقائق سے ہی متعلق نہیں ہے، بلکہ یہ مسئلہ صفات الٰہی سے بھی تعلق رکھتا ہے، ذات بحت کے علاوہ اسماء اورصفات کی بحث بھی ضروری ہے''(۲)۔

سرزمین ہند میں منصب امامت پر فائز دوسرے ہزارے کے مجدد شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے اس مسئلے میں جولوگ غلط رُخ اختیار کر چکے تھے، ان کا رخ دوسری طرف پھیرنے کے لیے وحدۃ الشہود کی تعبیر پیش کی تاکہ تنزیہ باری تعالی میں کسی قسم کا وہم نہ پیدا ہو، پھر جب حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا زمانہ آیا، تو بعض اہل علم نے آپ سے اس مسئلے کی حقیقت دریافت کی، تو آپ نے وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود میں تطبیق پیش کی اور ثابت کیا کہ حقیقت ایک ہے، فرق صرف تعبیر کا ہے، اور یہ صرف لفظی اختلاف ہے، حقیقی نہیں (۳)۔

مولانا غلام یحییٰ بہاری -متوفی تقریباً ۱۱۸۶ھ- ہندوستان کے ایک بہت بڑے عالم اور معقولات کے امام گزرے ہیں، سلوک وطریقت میں حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے ارادت کیش اور خلیفہٴ مجاز تھے، معقولات میں آپ کو ایسی دستگاہ حاصل تھی کہ اس فن میں اپنے تمام معاصرین

---

(۱) دمغ الباطل-مقدمہ مولانا عبدالحمید سواتی-:۲۸
(۲) دمغ الباطل-مقدمہ مولانا عبدالحمید سواتی-:۶
(۳) مقدمہ دمغ الباطل:۲۱-۲۰

واقران پر فائق تھے، چنانچہ اس فن میں آپ کی بعض کتابیں اور حواشی کافی شہرت کے حامل ہیں۔ مولانا بہاریؒ نے 'کلمات الحق' کے نام سے ایک رسالہ تالیف کیا، جس میں شاہ صاحب کی اس تطبیق کا رد کیا۔

مولانا غلام یحییٰ مرحوم کے جواب کے بعد ان کے رد اور شاہ صاحب کے دفاع میں آپ کے خلف الرشید اور مسند علم ومعرفت کے جانشین مولانا شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے اس مسئلے پر قلم اٹھایا، اور یہ معرکتہ الآرا کتاب اور شاہکار عالم وجود میں آیا، جس میں انھوں نے نہایت تفصیل کے ساتھ مولانا بہاری مرحوم کا رد کیا ہے اور اس اہم اور دقیق مسئلے پر روشنی ڈالی ہے۔ مولانا عبدالحمید سواتی لکھتے ہیں:

''مسئلہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی اصل حقیقت اور دینی عقائد میں ان کا مرتبہ اور ضرورت سے بحث کی ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ علوم ومعارف، حقائق ودقائق، اسرار ونکات کا ایک بحر ذخار بہا دیا ہے، اہل علم جب اس کو غور سے پڑھیں گے، تو انھیں اس میں علوم ومعارف کے بڑے بڑے خزانے دستیاب ہوں گے، اور انھیں معلوم ہوگا کہ اس عظیم باپ کے اس عظیم فرزند کو خدا تعالی نے علوم وحکمت سے کس قدر نوازا ہے''(۱)۔

تذکرہ نگاروں نے شاہ رفیع الدین صاحب کی اس کتاب کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے، اور اس کتاب کے اسلوب تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو لکھتے وقت ان کی طبیعت جولانی پر اور ان کا قلم اپنی پوری روانی پر ہے، اور کہیں کہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وجد کا عالم طاری ہے۔ چنانچہ اسی ملی جلی کیفیت کا اثر ہے کہ سرسری نظر ڈال کر فرق کرنا مشکل ہے کہ اصل کتاب عربی میں ہے یا فارسی میں، اس لیے کہ عربی اسلوب اختیار کرتے ہیں، تو صفحات کے صفحات صرف عربی میں کلام کرتے ہیں، اور فارسی میں قلم چلتا ہے، تو کہیں رکنے کا نام ہی نہیں لیتا۔

اس کتاب کا نام شاہ صاحب نے 'الفیض بالحق' اور لقب 'دمغ الباطل' رکھا ہے۔ اور مولانا عبدالحمید صاحب سواتی کے تصحیح وتقدمہ کے ساتھ ۱۹۷۶ء میں ادارۂ نشر واشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ سے شائع ہوئی ہے۔

دمغ الباطل کی اشاعت میں علامہ اعظمیؒ کا حصہ:

علامہ اعظمیؒ کو خود بھی شاہ رفیع الدین صاحب کی تصانیف سے دلچسپی تھی، اور آپ ان کی

(۱) مقدمہ دمغ الباطل: ۲۴

اشاعت کے لیے متمنی اور فکر مند تھے، اور پھر مولانا عبدالحمید سواتی گوجرانوالہ کا شغف دیکھا، تو علم وفن کی اس خدمت کے لیے کسی بھی تعاون سے دریغ نہیں کیا، مولانا عبدالحمید سواتی نے علامہ اعظمیؒ کا ایک مکتوب نقل کیا ہے، جو ۱۱رنومبر ۱۹۶۴ء کا مرقوم ہے، اس میں علامہ اعظمیؒ نے مولانا سواتی کو لکھا ہے:

''حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کی تصنیفات سے جو شغف آپ کو ہے، اور ان کے علوم ومعارف کی اشاعت کی جو لگن آپ کے دل میں ہے اور اس سلسلہ میں آپ جو مسلسل دماغ سوزی فرمارہے ہیں، اس کے لیے آپ بہت زیادہ مستحق مبارک باد ہیں۔ اس بات کو میں نے پہلے ہی بھانپ لیا تھا، اس لیے مجھ کو بھی لالچ تھا کہ اس سلسلہ میں جو تعاون ممکن ہو اس سے دریغ نہ کروں۔ اس خیال کے تحت 'دمغ الباطل' کی نقل حاصل کرنے اور منقولہ نسخہ کو دوسرے نسخوں سے مقابلہ کرانے کی کوشش کرتا رہا''(۱)۔

اس کتاب کے قلمی نسخوں کی دریافت اور اس کو لائق اشاعت بنانے میں علامہ اعظمیؒ کا بہت بڑا حصہ رہا ہے، آپ نے رام پور سے اس کی ایک نقل تیار کرائی، پھر اپنے بعض ذی استعداد شاگردوں کے ذریعے اس نقل کا اصل سے مقابلہ کرایا، اور اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ جہاں تک ممکن ہوا خود بھی نظر ثانی کر کے حتی الامکان اس کی تصحیح کی۔ مولانا عبدالحمید سواتی اس کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''پاکستان میں مختلف جگہوں میں پتہ کیا گیا، مگر کوئی قلمی نسخہ 'دمغ الباطل' کا دستیاب نہ ہوسکا، میں نے انڈیا میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی دامت برکاتہم سے خط وکتابت کی، تو معلوم ہوا کہ 'دمغ الباطل' کا قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے؛ چنانچہ میں نے حضرت مولانا کے توسط سے اس کی نقل حاصل کرنے کی کوشش شروع کردی، حضرت مولانا اعظمی صاحب نے رضا لائبریری کے انچارج سے بات چیت کر کے کاتب سید محمود علی رام پوری سے نقل کرانی شروع کرادی، کاتب صاحب نے اس کی نقل نومبر ۱۹۶۳ء کو مکمل کرلی''(۲)۔

علامہ اعظمیؒ نے جب اس نقل کو دیکھا، تو اصل سے مقابلہ کرنے کے لیے دو عالموں کو رام پور

---

(۱) مقدمہ دمغ الباطل: ۳۰

(۲) ایضاً: ۲۹-۲۸

بھیجنا ضروری سمجھا، مولانا سواتی نے لکھا ہے:

''چنانچہ نقل کے بعد جب یہ نسخہ مولانا اعظمی صاحب کے پاس پہنچا تو اس کی اغلاط کی بنا پر اصل کے ساتھ ملانا ضروری تھا، چنانچہ مولانا اعظمی نے لکھا کہ:

''دو عالموں کو 'دمغ الباطل' کی تصحیح کے لیے رام پور جانے پر آمادہ کر رہا ہوں، دونوں صاحبوں نے شوال میں جانے کو لکھا ہے۔ خدا کرے کہ کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے''(۱)۔

اس کے بعد حضرت مولانا عبدالحفیظ بلیاویؒ -مصنف مصباح اللغات وسابق استاذ ندوۃ العلما لکھنؤ- اور مولانا اقبال احمد صاحبان کے رام پور جانے اور پوری تن دہی اور محنت کے ساتھ اس کے مقابلہ کرنے کی تفصیل لکھی ہے۔

اس کے بعد آپ نے بھی اس پر نظر ثانی فرمائی اور جہاں تک ہو سکا اس کی تصحیح فرما کر اس کی نقل کو مولانا سواتی کے پاس بھیج دیا۔ مولانا سواتی نے لکھا ہے:

''علاوہ ازیں مولانا اعظمی صاحب نے خود بھی 'دمغ الباطل' کے تقریباً ڈیڑھ سو صفحات دیکھے اور تصحیح بھی فرمائی۔ مولانا اعظمی نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ 'دمغ الباطل' کا ایک قلمی نسخہ حیدرآباد دکن میں سالار جنگ کے کتب خانہ میں بھی موجود ہے اور میری نظر سے گذرا ہے، اور سنا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں بھی اس کا قلمی نسخہ موجود ہے، اور بعض احباب نے یہ بھی بتایا کہ 'دمغ الباطل' کا ایک نسخہ بریلی میں حکیم نثار احمد صاحب کے کتب خانہ میں بھی موجود ہے''(۲)۔

بہر حال اس خط سے، اس کے نسخوں کی طرف رہنمائی اور بے دریغ تعاون سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اعظمیؒ کو اس علمی سرمائے کی اشاعت کی کس قدر فکر دامن گیر تھی، اور ان کی مخلصانہ توجہات اور کوششوں سے کیسے کیسے گوہر نایاب گوشۂ گمنامی سے نکل کر اور زیور طباعت سے آراستہ و پیراستہ ہو کر علمی حلقوں اور اہل علم کے ہاتھوں تک پہنچے۔

داستاں ان کے اداؤں کی ہے رنگیں لیکن اس میں کچھ خون تمنا بھی ہے شامل میرا

☆......☆......☆

(۱) مقدمہ دمغ الباطل: ۲۹ (۲) ایضاً: ۳۱-۳۰

تکمیل الاذہان

یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے فکر ونظر کی تقویت اور ذہن ودماغ کی بالیدگی کے لیے لکھی گئی ہے، محقق ومصحح مولانا عبدالحمید سواتی کے بقول یہ شاہ صاحب کی سب سے آخری تصنیف ہے، جس سے ظاہر ہے کہ اس میں حضرت مصنف نے اپنے علوم وفنون اور فضل وکمال کی پختگی اور کہنہ مشقی کا کس قدر مظاہرہ کیا ہوگا، چنانچہ مولانا سواتی اپنے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''شاہ رفیع الدین نے اپنی اکثر تصانیف میں اختصار پسندی کا شیوہ اختیار کیا ہے، لیکن 'تکمیل الاذہان' میں تو آپ نے بہت ہی زیادہ اختصار کو ملحوظ رکھا ہے، بلکہ علمی تصانیف کے سلسلہ میں جس قدر متون لکھے گئے ہیں، مثلاً: علامہ تفتازانی کی 'تہذیب'، علامہ ابن حاجب کا 'کافیہ'، عبداللہ نسفی کی 'کنز الدقائق'، محبّ اللہ بہاری کا 'سلم العلوم' اور 'مسلم الثبوت' وغیرہ، ان تمام متون سے کہیں بہت زیادہ اختصار شاہ رفیع الدینؒ نے 'تکمیل الاذہان' میں اختیار کیا ہے، بلکہ اختصار کی حد کر دی ہے، بعض مقامات پر تو چیستان یا الغاز ومعمّٰی قسم کی عبارت نظر آئے گی؛ بایں ہمہ یقینی بات ہے کہ علمی نکات سے لبریز کتاب ہے''(۱)۔

اس کتاب میں چار ابواب ہیں، باب اول منطق کے بیان پر مشتمل ہے، چونکہ مختلف علوم میں منطق سے امداد حاصل کی جاتی ہے، اس لیے شاہ صاحبؒ نے منطق کو بھی تکمیل اذہان میں جگہ دی ہے۔ اس باب میں ایک مقدمہ، دو مقصد اور ایک خاتمہ ہے۔

مقدمہ میں علم کی تعریف اور ''علم کاسِب'' کی دو قسمیں تصور وتصدیق ذکر کی ہیں، اور پھر نظر وفکر کی تعریف کی ہے، اس میں اور بھی بہت سے مفید نکات اور دقائق ذکر کیے ہیں، چنانچہ مقدمہ کا تعارف کراتے ہوئے مولانا سواتی نے لکھا ہے:

''شاہ رفیع الدینؒ نے مقدمہ میں بہت سی مفید اور گرانقدر علمی باتیں درج فرمائی ہیں، بعض باتیں تو ایسی ہیں کہ بالکل بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحب نے اس فن میں اضافات فرمائے ہیں''(۲)۔

مقدمہ کے بعد مقصد اول میں ''تصورات'' کا بیان ہے۔

---

(۱) مقدمہ تکمیل الاذہان: ۱۴ (۲) ایضاً: ۴

دوسرے مقصد میں ’’تصدیقات‘‘ کا بیان ہے، اس کی ابتدا شاہ صاحب نے ’’قضیہ‘‘ کی تعریف سے کی ہے، آپ نے اس کی تعریف یہ کی ہے: القضيةُ قولٌ حاكٍ عنِ الواقع إيجاباً أو سلباً. اس تعریف پر مولانا سواتی نے مقدمہ میں یہ تبصرہ کیا ہے کہ قضیہ کی ایسی جامع مانع تعریف واقعی شاہ صاحب کا اس فن میں مجتہدانہ کمال ہے۔ اس کے بعد ’’تصدیقات‘‘ کی تفصیلات بیان کی ہیں۔

پہلا باب ۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

’تکمیل الاذہان‘ کا دوسرا باب ’’تحصیل‘‘ ہے، اس میں تحصیل کی تعریف اور اس کی تدوین کی تاریخ بیان کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فن کو دراصل ان کے والد حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے مدوّن کیا ہے، پھر شاہ رفیع الدینؒ نے اس میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ نے اس فن کو ’’فن دانشمندی‘‘ سے تعبیر فرمایا ہے۔ شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے ’’تحصیل‘‘ کی ابتدا میں اس کا موضوع اور غرض وغایت بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ اس فن میں پانچ چیزوں پر نگاہ ہوتی ہے:

۱-مناظرہ، ۲-تدریس، ۳-تلمذ، ۴-تصنیف، ۵-مطالعہ۔

ان پانچ چیزوں میں انحصار کی وجہ شاہ صاحب نے یہ بیان کی ہے کہ منکر کے ساتھ مناظرہ کی ضرورت پڑتی ہے، اور ماننے والے کے حق میں تلمذ اور تدریس کا سلسلہ ہوتا ہے، اور یہ تینوں باتیں تقریر کے ذریعے ہوتی ہیں؛ اور تحریر کی شکل میں تصنیف اور مطالعہ کی ضرورت پڑتی ہے(۱)۔

پھر شاہ صاحب نے ان پانچوں میں سے ہر ایک کی تفصیلات بیان کی ہیں، اور ان کے قواعد وضوابط تحریر فرمائے ہیں۔ کتاب کا یہ حصہ پندرہ صفحات پر مشتمل ہے۔

تیسرے باب میں امور عامہ کے ان خاص مباحث کو ذکر کیا ہے، جو کثیر الاستعمال ہیں اور اگر ان میں غلطی واقع ہو جائے تو انسان اشتباہ میں پڑ جاتا ہے، اور یہ خاص مباحث عقلیات کے مختلف علوم وفنون کے اہم مبادیات میں شمار ہوتے ہیں(۲)۔

چوتھے باب میں ’’تطبیق آراء‘‘ کا بیان ہے۔ اس باب کا تعارف کرتے ہوئے مولانا سواتی نے لکھا ہے:

---

(۱) دیکھئے مقدمہ تکمیل الاذہان از مولانا سواتی: ۶ (۲) ایضاً: ۸

''اگر چہ شاہ صاحب سے قبل بھی اہل علم نے مختلف ومتضاد نظریات واقوال وآراء میں کچھ نہ کچھ تطبیق دی ہے، خصوصاً محدثین کرام اور فقہاء امت اس سلسلہ میں بہت مشہور ہیں کہ وہ متخالف ومتعارض احادیث کے جمع وتطبیق میں کوشاں رہتے ہیں، لیکن یہ شرف وسعادت صرف شاہ رفیع الدینؒ کو حاصل ہوا ہے کہ انھوں نے تطبیق الآراء کو ایک مستقل علمی فن بنادیا ہے، اور اس کے اصول وضوابط اور قواعد ومبانی متعین کیے ہیں، اور پھر دنیا میں جو مختلف ومتحارب نظریات پائے جاتے ہیں اور بعض اہم متقابل ومتضارب باتوں کو عملی شکل میں تطبیق دی ہے''(۱)۔

اس باب کو شاہ صاحب نے چھ ۶ فصلوں میں منقسم کیا ہے، فصل اول ماہیتِ تطبیق کے بیان میں، فصل دوم موازین تطبیق کے بیان میں، فصل سوم اسباب اختلاف میں، فصل چہارم ضوابط تطبیق کے بیان میں، فصل پنجم جرح وترجیح کے بیان میں، اور فصل ششم تطبیق کی مثالوں پر مشتمل ہے، جو واہم (غلطی کرنے والے) کے لیے توضیح اور فاہم (سمجھ دار) کی تمرین کے لیے ہے۔

سابقہ دونوں رسالوں کی طرح اس رسالے کی تصحیح اور اشاعت میں بھی علامہ اعظمیؒ کا خاص حصہ رہا ہے، چنانچہ اس کے محقق اور مصحح مولانا سواتی نے اس کے مختلف قلمی نسخوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس کے بعد 'تکمیل الاذہان' کا نسبتاً ایک بہتر اور جامع قلمی نسخہ ہمیں مجلس علمی کراچی کے ناظم حضرت مولانا محمد طاسین صاحب مدظلہ سے حاصل ہوا، یہ بڑا صحیح اور مکمل نسخہ ہے؛ در اصل یہ نسخہ فخر المحدثین، سید الفقہاء وتاج العلماء حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی دیوبندی دامت برکاتہم کے توسط سے حاصل کیا گیا ہے، اور آپ نے اس کی تصحیح بھی کی ہے، اور بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ یہ نسخہ متعدد قلمی نسخوں سے تقابل کے بعد تیار کیا گیا ہے''(۲)۔

اسی طرح درمیان کتاب میں الباب الثانی کے بعد کتاب شروع ہونے سے پہلے مولانا سواتی نے یہ نوٹ لکھا ہے:

نقلنا هذا الباب أولاً من كتاب أبجد العلوم بقیہ صفحہ ۷۱ پر

(۱) مقدمہ تکمیل الاذہان از مولانا سواتی: ۱۰ (۲) ایضاً: ۱۶

شیخ الکل فی الکل میاں سید نذیر حسین محدث دہلویؒ اور تصوف

از: ڈاکٹر عبدالمعید صاحب، کھیری باغ روڈ، مئو

آج جسے تصوف اور درویشی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے، زبان نبوی سے اسے ''احسان'' کہا گیا ہے۔ عوام اور بعض صوفیاء قسم کے لوگ ظاہری احکام کو ''شریعت'' اور تصفیہ باطن کو ''طریقت'' اور مشاہدہ ومراقبہ کو ''حقیقت'' کہتے ہیں۔ (کرامات اہل حدیث ص ۱۵۳ از مولانا عبدالمجید سوہدرویؒ)

قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ جنھیں شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ بیہقیِ وقت کہا کرتے تھے انھوں نے اپنی فقہ کی کتاب ''مالا بدمنہ'' میں ایک باب ''کتاب الاحسان'' قائم کیا ہے، اس کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

> بداں اسعدک اللہ تعالیٰ ایں ہمہ گفتہ شد صورت ایمان واسلام وشریعت است ومغز وحقیقتِ او درخدمت درویشاں باید جست وخیال نباید کرد کہ حقیقت خلاف شریعت است کہ ایں سخن جہل وکفر است (مالا بدمنہ ص ۱۱۸-۱۱۷)

جانو! اللہ تعالیٰ تم کو نیک بخت بنائے کہ یہ بیان جو گذرا یہ تو ایمان واسلام اور شریعت کی ظاہری صورت تھی۔ باقی اس کا مغز اور حقیقت درویشوں کی خدمت میں تلاش کرنا چاہئے۔ اور یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہئے کہ حقیقت شریعت کے خلاف (یعنی مقابل) کوئی چیز ہے کیوں کہ ایسی بات جہل اور کفر ہے۔

آگے ولی کی پہچان تحریر فرماتے ہیں:

> ولی درقرآن متقی را فرمودہ ودرحدیث علامت اولیاء اللہ فرمودہ کہ درصحبت او خدا یاد آید یعنی محبت دنیا درصحبت او کم شود ومحبت حق زیادہ گردد (مالا بدمنہ ص ۱۱۸)

قرآن میں ولی متقی شخص کو کہا گیا ہے اور حدیث میں اولیاء اللہ کی علامت یہ بتائی گئی ہے کہ اس کی صحبت میں خدا یاد آئے یعنی دنیا کی محبت کم ہو اور اللہ کی محبت زیادہ ہو۔

کوئی بھی شخص جو ولایت کا مدعی ہوگا اس کو قرآن وحدیث کے ترازو پر تولا جائے گا، اس لیے کہ ہر گروہ میں اصلی ونقلی کا وجود برقرار ہے۔ اہل حدیث عالم مولانا عبدالمجید سوہدرویؒ تحریر فرماتے ہیں:

ولی وہی ہوسکتا ہے جو سنت کا سچا پروانہ اور رسول اللہ ﷺ کا گرویدہ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ اہل حدیث سے زیادہ سنت نبوی کا پابند اور رسول اکرم ﷺ کا محبّ کون ہوسکتا ہے؟ آپ نام کے اہل حدیثوں کو نہ دیکھئے کیوں کہ فی زمانہ تو کثرت سے ایسے ہی اہل حدیث کہلانے والے ہیں جو ''بدنام کنندہ نکو نامے چند'' ہیں یا ''برعکس نہند نام زنگی کافور'' کے مترادف ہیں۔ بہرحال کسی اہل حدیث کو دیکھنے اور جانچنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ دیکھ لیا جائے کہ اس کا تعلق نبی ﷺ سے کتنا ہے اور وہ سنت کا کہاں تک پابند ہے، (کرامات اہل حدیث ص ۴۷)

مزید تحریر فرماتے ہیں:

جب ہم کہتے ہیں کہ ہر اہل حدیث اللہ کا ولی ہے تو اس سے ہماری مراد رواجی اہل حدیث، بے نماز، داڑھی منڈے، سودخور اور بدعمل وغیرہ گرہ گیر قسم کے لوگ نہیں، بلکہ وہ ہیں جو عقیدہ وعمل ہر اعتبار سے صحیح معنی میں اہل حدیث ہیں۔ (کرامات اہل حدیث ص ۵۷)

مولانا سوہدروی رحمۃ اللہ علیہ محبوب ربانی شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے تئیں اپنی عقیدت اور قلبی جذبات کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں:

ہم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمہ اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کو اللہ کا ولی مانتے ہیں، ہم ان کے بارے میں حسن ظن رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ دونوں رب کے محبوب اور اللہ کے فضل سے اہل حدیث (یعنی قرآن وحدیث کے حامل وعامل) تھے۔ اور اہل حدیث ہی نہیں بلکہ اہل حدیث گر تھے۔ (کرامات اہل حدیث ص ۵۹)

صوفیوں کی جماعت میں بھی عیار اور مکار بہروپئے موجود ہیں، ایسوں ہی کے متعلق علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے:

الٰہی یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

حالانکہ وہ سچے صوفیوں سے بے پناہ عقیدت رکھتے ہیں:

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کو ارادت ہو تو دیکھ ان کو ید بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو موج نفس ان کی الٰہی کیا دھرا ہوتا ہے اہل دل کے سینوں میں
تمنا درد دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی نہیں ملتے یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

اقبالؒ

محققین صوفیا نے ہر زمانہ میں نام نہاد صوفیوں پر جو قرآن اور سنت سے ہٹے ہوئے تھے سخت نکیر فرمائی ہے، شیخ اور سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند خواجہ محمد معصوم سرہندی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک مرید ''عبدالحکیم'' کے نام تحریر فرماتے ہیں:

اے بھائی! ناجنس اور مخالف طریق کی صحبت سے بچتے رہنا اور بدعتی کی مجلس سے گریزاں رہنا۔ یحییٰ معاذ رازی قدس سرہ کا مقولہ ہے کہ:

ان تین اصناف سے اجتناب کرو:

(۱) علماء غافلین (۲) قرائے مداہنین اور (۳) متصوفہ جاہلین

جو شخص مسند مشیخت پر بیٹھا ہوا ہے، اور اس کا عمل موافق سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہے اور نہ وہ خود زیور شریعت سے آراستہ ہے، خبردار۔ خبردار۔ اس سے دور رہنا بلکہ (احتیاطاً) اس شہر میں بھی نہ رہنا جس میں ایسا (مکار) رہتا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ کچھ عرصے بعد اس کی طرف میلان ہو جائے اور کارخانہ روحانیت خلل پذیر ہو۔ ایسا شخص ہرگز اقتداء کے لائق نہیں ہوتا، وہ تو درحقیقت ایک چور ہے پنہاں...... ہر چند کہ اس سے طرح طرح کے خوارق عادات دیکھو اور اس کو دنیا سے بظاہر بے تعلق بھی پاؤ (کبھی اس کی طرف ملتفت نہ ہونا) اس کی صحبت سے اس طرح بھاگنا جس طرح شیر سے بھاگتے ہیں۔

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی قدس سرہ فرماتے ہیں:

''کامیابی کے تمام راستے بند ہیں سوائے اس شخص کے راستے کے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نشان قدم کی پیروی کرے۔''

سید الطائفہ ہی کا یہ قول بھی ہے کہ:

''مقربین صادقین کا راستہ درحقیقت کتاب وسنت کے ساتھ وابستہ ہے، اور وہ علماء جو شریعت وطریقت پر عامل ہیں اور وارث النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہلانے کے مستحق ہیں وہ اقوال، اخلاق

اور افعال میں آں حضرت ﷺ کے متبع ہوتے ہیں''۔

(مکتوباتِ خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ ص ۶۳-۶۲)

میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ، نواب صدیق حسن خاں بھوپالی رحمۃ اللہ، مولانا عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ، مولانا عبدالرحمٰن لکھوی رحمۃ اللہ، مولانا ابراہیم آروی رحمۃ اللہ، مولانا شمس الحق ڈیانوی رحمۃ اللہ، مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمۃ اللہ، مولانا ابراہیم سیالکوٹی رحمۃ اللہ، مولانا عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ، مولانا داؤد غزنوی رحمۃ اللہ، اور مولانا اسحاق بھٹی رحمۃ اللہ وغیرہ اکابر علماء اہل حدیث شریعت وطریقت کے جامع تھے۔ موجودہ دور کے اہل حدیثوں کے طرز عمل پر شدید تنقید کرتے ہوئے مولانا اسحاق بھٹی رحمۃ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

نہایت افسوس ہے کہ اب دعا وظائف اور تصوف کی روایت جماعت اہل حدیث میں ختم ہوگئی ہے، بلکہ میں نے سنا ہے کہ بعض برخود غلط لوگ اسے بدعت قرار دیتے ہیں، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

بات یہ ہے کہ ہمارے پرانے عالموں اور بزرگوں کی حالت ایسی تھی کہ انھیں ہر وقت اللہ کی ضرورت رہتی تھی، وہ اس کے محتاج تھے، ہر شی اسی سے مانگتے اور ہر وقت مانگتے تھے۔ نماز کے بعد بھی اور دیگر اوقات میں بھی۔ ہاتھ اٹھا کر بھی اور بغیر ہاتھ اٹھائے بھی۔ وہ غریب تھے، نادار تھے اور اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑاتے تھے۔ دور حاضر کے عالموں کے پاس سب کچھ موجود ہے، زمینیں بھی، کاروبار بھی، کوٹھیاں بھی، موٹریں بھی اور بڑی بڑی ملازمتیں بھی، ان کے بیٹے سمندر پار کی یونیورسٹیوں میں پڑھتے بھی ہیں اور کماتے بھی ہیں۔ کروڑوں میں کھیلتے ہیں اور اربوں کے خواب دیکھتے ہیں۔ انھیں کیا ضرورت ہے اللہ سے ہاتھ اٹھا کر مانگنے اور اس کے احسان مند ہونے کی، یہی وجہ ہے کہ ادھر سلام پھیرا اور ادھر یہ کوتل گھوڑے کی طرح اچھل کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا تو رہا ایک طرف گوناگوں مصروفیتوں کی بناء پر بے چاروں کے لیے نماز پڑھنا مشکل ہے۔

پھر یہ بات بھی ان کے نزدیک متحقق ہوگئی ہے کہ نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کی روایات کے راوی ضعیف ہیں۔ اس تحقیق کے بارے میں اس فقیر پر تقصیر کی مؤدبانہ گذارش ہے کہ کیا وہ راوی ہم سے بھی ضعیف ہیں جو بات بات میں غلط بیانی کرتے، قدم قدم پر جھوٹ بولتے اور ہر معاملہ میں دوسرے کو دھوکا دیتے ہیں۔

یہاں یہ یاد رہے کہ وظائف وادعیہ تین قسم کے ہیں، ایک وہ جو قرآن مجید میں مذکور ہیں، دوسرے وہ جن کا کتب حدیث میں ذکر فرمایا گیا ہے اور تیسرے وہ جو بزرگان دین سے منقول ہیں اور بعض امور میں ومعاملات میں مجرب ہیں۔ ہمارے بزرگ علماء ان تینوں پر عامل رہے ہیں اور اب بھی اللہ کے نیک بندے جن کو اللہ نے توفیق دی ہے ان پر عامل ہیں۔

وظیفے کے عمل اور لفظ سے بعض دوست آخر گھبراتے کیوں ہیں؟ اگر ان کے بچوں کو اسکول سے وظیفہ ملے تو بڑے خوش ہوتے ہیں اور گھر گھر بتاتے پھرتے ہیں کہ ان کے بچے ماشاءاللہ اتنے ہوشیار ہیں کہ وظیفہ لے رہے ہیں۔لیکن اگر اللہ ورسول کا بیان فرمودہ وظیفہ پڑھنے کو کہا جائے تو غلط ہو جائے، یہ عجیب منطق ہے کہ حکومت سے وظیفہ حاصل کرنا بالکل صحیح اور اللہ کے نام کا وظیفہ پڑھنا قطعی بدعت۔

سچی بات یہ ہے کہ اگر کوئی وظیفہ دل لگا کر اور متوجہ الی اللہ ہو کر پڑھا جائے تو بے عمل سے بے عمل کو بھی ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے قلب پر سکون واطمینان کی بارش ہو رہی ہے، اور کیفیت عالم بالکل بدل گئی ہے:

ہوا مسیح نفس گشت و باد نافہ کشا	درخت سبز شد و مرغ در خروش آمد
تنور لامہ چناں برفروخت باد بہاد	کہ غنچہ غرق عرق گشت و گل بہ خوش آمد

(نقوش عظمت رفتہ ۲۵-۲۴-۲۳)

میاں صاحبؒ شیخ طریقت:

صوفیاء کرام کے سارے مروجہ اعمال آپ کے یہاں رائج تھے اور صوفیاء کے مروجہ طریقہ پر بیعت بھی فرمایا کرتے تھے، آپ کے شاگرد اور سوانح نگار مولانا فضل حسین بہاری تحریر فرماتے ہیں:

آپ کے یہاں بیعت کی تمام قسمیں رائج تھیں، سوائے بیعت خلافت، بیعت جہاد، بیعت ثبات فی القتال اور بیعت ہجرت کے، نیز مریدین کو ان کے حسب حال بیعت فرماتے تھے، مولف نے بیعت کی بارہ قسمیں بیان کی ہیں اور آخری قسم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ بیعت طریقت ہے۔　　(الحیاۃ بعد الممات ص ۷۶)

نیز فرماتے ہیں:

سفر بنگال کے دوران آپ کی خدمت میں بے شمار لوگ آئے اور بیعت سے مشرف

ہوئے۔ (ایضاً ص ۱۴٦)

مزید فرماتے ہیں:

پنجاب میں لوگوں نے آپ کے دست مبارک پر بیعت کی، ایک دن آپ کا بیان ہوا، معتقدین کثرت سے آئے، جب بیان ختم ہوا، تو لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: میں تمام لوگوں کو اجازت دیتا ہوں، اور سب کو بہ تاکید کہتا ہوں کہ روزانہ ''قرآن صغیر'' کے ختم پر پابندی کریں جس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے سورہ فاتحہ پڑھیں، پھر سورہ بقرہ شرع سے **ھـــم المفلحون** تک، پھر **شھد اللّٰہ** کی آیت آخر تک، پھر ''**قل اللّٰھم مالک الملک** '' آخر آیت تک، پھر سورہ حشر کا آخر، پھر سورہ کافرون، سورہ اخلاص، اور اخیر میں معوذتین۔

(فتاویٰ اللجنہ ج۲ ص ۱۸۴)

شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ سے میاں صاحبؒ کی عقیدت:

آپ طبقہ علماء میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کو بڑی عظمت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور فرماتے تھے:

واقعی آپ خاتم ولایت محمدیہ ہیں۔ (الحیاۃ بعد المماۃ ص ۱۲۳)

جب آپ (میاں صاحبؒ) کتاب الرقاق کا درس دیتے اور تصوف کے حقائق ونکات بیان کرتے تو فرماتے: صاحبو! ہمیں تو یہاں احیاء العلوم نظر آ رہی ہے۔ (ایضاً)

مولوی فضل حسین بہاری تحریر فرماتے ہیں:

مولانا قاضی بشیر الدین قنوجی (جو شیخ اکبر کے شدید مخالف تھے) اپنے موقف پر شیخ (نذیر حسین) سے مناظرہ کرنے دہلی آئے، اور دو مہینہ مقیم رہے، روزانہ مجلس مناظرہ منعقد ہوتی مگر ہمارے شیخ اپنے موقف اور اپنی عقیدت سابقہ پر اڑے رہے بالآخر قاضی صاحب دو مہینے کے مباحثے کے بعد ناکام ونامراد واپس ہو گئے۔ (الحیاۃ بعد المماۃ ص ۱۲۳)

دوسرا واقعہ تحریر فرماتے ہیں:

شیخ ابو الطیب محمد شمس الدین شیخ اکبر اور آپ کی کتاب ''فصوص الحکم'' کے بارے میں ہمارے شیخ سے بحث ومباحثہ کرتے رہتے تھے، اول تو شیخ نے ان کو سمجھانے کی کوشش کی مگر

جب ان کی طرف سے انکار بڑھتا گیا اور اعتراضات کا سلسلہ بند نہیں ہوا تو فرمایا:

''الفتوحات المکیہ'' شیخ اکبر کی آخری تصنیف ہے اور یہ ان کی تمام تصانیف سابقہ کے لیے ناسخ ہے۔ (ایضاً ص۱۲۳)

مجاہدہ اور معمولات زندگی:

مولانا فضل حسین بہاری فرماتے ہیں:

سوائے ان تین چار گھنٹوں کے جو نیند کی حالت میں گذرتے تھے، مشکل ہی سے کسی ایسے وقت کی نشاندہی کی جاسکتی ہے، جب حضرت میاں صاحبؒ باوضو نہ ہوں، وہ شب کو ایک بجے بیدار ہوجاتے اور وضو کرکے نماز تہجد پڑھنا شروع کردیتے، ساڑھے تین بجے تک یہ عمل جاری رہتا، اس کے بعد مسجد میں جاتے پھر مسجد کے اندر یا صحن میں بیٹھ کر مراقبے کی سی کیفیت اختیار کرلیتے، اور ذکر الٰہی میں مصروف ہوجاتے، اس وقت بالعموم نہایت دردناک لہجہ میں موقعے کی مناسبت سے عربی فارسی اور اردو کے اشعار بھی پڑھتے، جیب میں تسبیح بھی رہتی اور وہ ہاتھ میں منتقل ہوجاتی، ماثورہ اوراد واذکار پڑھنے کا سلسلہ بھی جاری رکھتے، نماز فجر کے بعد قرآن مجید کا درس ہوتا، پھر گیارہ بجے تک طلباء کو حدیث شریف پڑھاتے، گیارہ بجے مسجد سے گھر تشریف لے جاتے اور بارہ بجے واپس مسجد آجاتے۔ اس وقت سے مغرب تک تین وقتوں کی نمازیں اور درس کے سوا اور کوئی کام نہ ہوتا۔ مغرب کے بعد نماز پڑھ کر گھر چلے جاتے اور پھر ثلث شب کے قریب نماز عشاء کے لیے مسجد آتے، حوائج ضروریہ کے علاوہ ان تمام وقت میں وہ باوضو اور طاہر رہتے، نماز نہایت اعتدال اور خشوع وخضوع سے پڑھتے، قرأت میں ایسی خشیت طاری ہوتی اور اس طرح اللہ کی طرف رجوع فرماتے کہ ان تعبدو اللہ کانک تراہ کی کیفیت طاری ہوجاتی۔ (دبستان حدیث ص۵۳)

اویس زمانہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ سے عقیدت:

مولانا تجمل حسین بہاریؒ تحریر فرماتے ہیں:

ایک بار مولوی نذیر حسین صاحب محدث دہلویؒ نے حضرت قبلہ (مولانا فضل رحمٰن صاحبؒ) کو بڑی تعظیم وتکریم سے خط لکھا اور اپنے بھانجے یا بھتیجے کو مرید کروانے کے لیے

بھیجا تھا اور لکھا تھا کہ یہ آپ کے شوق میں حاضر ہوتے ہیں، درویشی کی تعلیم ان کو فرمائیے، آپ نے ان کو مرید کیا اور طریقہ اللہ کے نام لینے کا بتایا۔ (کمالات رحمانی ص ۹۰)

مولانا اسحاق بھٹیؒ تحریر فرماتے ہیں:

ایک مرتبہ ایک طالب علم نے ان (میاں صاحبؒ) سے درخواست کی کہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کے نام خط لکھ دیں کہ وہ اس کی تعلیم وتربیت کریں، میاں صاحبؒ نے خط لکھ کر اسے دے دیا۔ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ نے اس خط کے جواب میں میاں صاحبؒ کو لکھا کہ آپ نے اس شخص کو میرے پاس کیوں بھیج دیا۔ وہ کون سی ایسی شرعی بات ہے جو ہم جانتے ہیں اور آپ نہیں جانتے، ہم آپ سے بڑے عالم نہیں ہیں۔

(دبستان حدیث ص ۶۷)

زہد وتوکل:

میاں صاحبؒ درویش منش عالم تھے، انھوں نے دہلی میں اپنی تعلیم رسمیہ مکمل کی اور پھر دہلی ہی میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا جو زندگی کی آخری دم تک جاری رہا، انھوں نے کہیں ملازمت نہیں کی، کسی کے دست نگر نہیں ہوئے، کوئی دولت جمع نہیں کی، کبھی کسی سرمایہ دار کے دروازے پر نہیں گئے، کوئی سرکاری عہدہ قبول نہیں کیا، قاضی القضاۃ کا منصب پیش کیا گیا، اسے بھی ٹھکرادیا، کسی کی مخالفت کی کبھی پرواہ نہیں کی، علم کو کسی وقت بھی ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ غربت کی زندگی بسر کرتے رہے، فاقوں پر فاقے آئے مگر دلی کو نہیں چھوڑا اور جس مقام پر حضرت شاہ اسحاق صاحبؒ نے بٹھادیا، تمام عمر وہیں بیٹھے رہے۔ اس شہر میں بے پناہ اثر ورسوخ کے باوجود اپنا ذاتی مکان نہیں بنایا، آخر وقت تک کرائے کے مکان میں رہے۔ (دبستان حدیث ص ۵۲)

غذا میں سادگی کا یہ حال تھا کہ زیادہ تر سرکہ کے ساتھ روٹی کھاتے یا فقط ستو پر اکتفا فرماتے یا شہد کے ساتھ روٹی کھالیتے، کبھی بھنے چنے پر گزارہ کرلیتے، کبھی روٹی اور معمولی سالن اور کبھی روٹی اور شہد پر بس کرتے۔ (ایضاً ص ۹۹)

میاں صاحبؒ کی کرامت:

مولانا بدر الحسن سہسوانی بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے میاں صاحبؒ کی دعوت

کی، میاں صاحب تشریف لائے، مگر کھانے سے قبل انھیں متلی سی ہوئی اور قے آنے لگی، اس لیے انھوں نے کھانا تناول نہیں فرمایا اور گھر تشریف لے گئے، ان کے گھر تشریف لے جانے کے بعد میرے ملازم کے پیٹ میں شدید درد ہونے لگا جس سے وہ نیم بسمل ہوگیا، اس کا نام عبدالنبی تھا اور رام پور کا رہنے والا تھا، میاں صاحب کے بارے میں اس کے دل میں سخت عداوت کے جراثیم پائے جاتے تھے، جب تکلیف بہت بڑھ گئی اور وہ اپنی زندگی سے مایوس ہوگیا تو اس نے مولانا بدرالحسن سہسوانی سے منت سماجت کی کہ آپ میاں صاحبؒ سے میرا قصور معاف کرادیجئے۔ یہ درد نہیں ہے بلکہ اللہ کی طرف سے میری غلطی کی سزا مل رہی ہے، اس نے بتایا کہ میاں صاحب سے سخت عداوت کی بنیاد پر میں نے بکرے کے گوشت کے بجائے ان کے لیے خنزیر کا گوشت پکایا تھا، مختصر قصہ یہ کہ ملازم کی درخواست پر مولانا ممدوح میاں صاحب کے یہاں ملازم کو لے گئے، پورا واقعہ سن کر میاں صاحب نے اللہ کا شکر ادا کیا اور ملازم کے لیے اس طرح دعا فرمائی۔

اے مجیب الدعوات! تیرے رسول کریم ﷺ کے ساتھ لوگوں نے کیا کچھ نہیں کیا، دھوکے بھی دیئے، شعبدے بھی کیے، پھر اگر مجھ ناچیز کے ساتھ کسی نے کچھ کیا ہے تو تو اسے معاف فرما، تو ارحم الراحمین ہے اور اسے ہدایت فرما۔ تو ہادی الضالین ہے، چنانچہ اسی وقت اللہ نے اس کو درد سے نجات بخش دی اور وہ میاں صاحب کے دست مبارک پر تائب ہوا۔ آپ کی بیعت کی اور اس کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ (دبستان حدیث ص ۵۹)

امام اعظم ابوحنیفہؒ کی عظمت:

محدث عظیم مولانا عبدالغفار صاحب عراقی مئوی تحریر فرماتے ہیں:

مولانا (سید نذیر حسین دہلوی) مرحوم نے ایک فتویٰ میں لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کو برا کہنے والا جھوٹا رافضی ہے۔ (تکملۃ الالجام ص ۵)

مولانا عبدالغفار صاحبؒ ٦ ۱۳۰ھ میں حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہیؒ سے حدیث کی فراغت کے بعد دہلی تشریف لے گئے۔ وہاں آپ نے میاں صاحبؒ سے بھی ملاقات کا شرف حاصل کیا، خود تحریر فرماتے ہیں:

گنگوہ سے سہارنپور اور سہارنپور سے دہلی پہنچا ماہ رمضان کی وجہ سے دہلی میں زیادہ نہ

ٹھہر سکا۔مگر جمعہ کے روز مولانا شاہ عبدالعزیز قدس سرہ اوران کے خاندان کی مزارات کی زیارت بھی کرلی اور شاہی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی، اور ایک روز مولوی سید نذیر حسین عرف میاں صاحب سے بھی ملاقات کرلی، بعدازاں کانپور ہوتا ہوا ماہ رمضان میں مکان پر پہنچا۔ (نخبۃ الاخبار من سوانح ابی الانوار)

حلم،عفوودرگزر:

کوئی میاں صاحب کی تنقیص کرتا یا انھیں نقصان پہنچاتا تو اس سے انتقام نہیں لیتے تھے اور ہنسی مذاق میں بات ٹال دیتے تھے،ایک روز بعد نماز صبح اور درس کے بعد ایک مطبوعہ نسخہ جیب سے نکال کر فرمایا، یہ نظم ہمیں ایک دوست نے ڈاک سے تحفتاً بھیجی ہے، پھر نظم حاضرین کو سنانا شروع کی جس میں میاں صاحب کی شدید مخالفت کی گئی تھی۔اس کا ایک ایک شعر وہ بار بار پڑھتے اور نہایت خوشی سے ہنس ہنس کر اس کی تشریح فرماتے،ظہر کے بعد ایک شخص نے عرض کی کہ صبح والی نظم کے جواب میں فلاں شخص نے ستر (۷۰) شعر لکھ چکے ہیں اور مزید لکھ رہے ہیں۔فرمایا ارے میاں اس کا جواب لکھ کر کیا کروگے،اس نے ہمیں کچھ دیا ہی ہے،ہم سے کچھ لیا نہیں،اگر چہ گالیاں دی ہیں، یہ فرما کر اس کا جواب لکھنے سے روک دیا۔ (دبستان حدیث ص۷۶)

ذکر الٰہی سے شغف اور تسبیح:

حضرت میاں صاحب تسبیح بالعموم ہاتھ میں رکھتے اور ذکر واذکار کرتے رہتے تھے،آخری دنوں میں کمزوری یادہ ہوگئی تو تسبیح ہاتھ سے گر جاتی تھی اور بے چینی سے اسے تلاش کرتے تھے، جب اردگرد بیٹھنے والوں کو معلوم ہوگیا کہ تسبیح ہاتھ سے گر جانے کی وجہ سے انھیں پریشانی ہوتی ہے تو وہ فوراً تسبیح اٹھا کر ان کے ہاتھ میں تھما دیتے اور وہ پڑھنے میں مصروف ہو جاتے۔اگر تسبیح جلدی ہاتھ میں نہ آتی تو انگلیوں پر پڑھتے رہتے،کبھی خود ہی بستر پر رکھ دیتے،کبھی گلے میں ڈال لیتے،غرض زبان پر ہر وقت تسبیح وتحمید کا سلسلہ جاری رہتا، بیہوشی کے حالت میں بھی ذکر الٰہی سے ان کی انگلیاں حرکت میں رہتیں اور لب اللہ کی یاد میں ہلتے رہتے۔ (ایضاً ص۹۴-۹۳)

اسلامی کتب خانے

(سولھویں قسط)

از: دکتور علی بن علی ابو یوسف جہنی   ترجمہ و تلخیص: مسعود احمد الاعظمی

مدارس کی ابتدا اور نشو ونما:

اسلامی معاشرے میں مدارس کا آغاز کب ہوا؟ بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ حقیقت پردۂ خفا میں ہے، اور اس کی تاریخ کسی خاص زمانے میں محدود نہیں کی جاسکتی۔

اور بعض دوسرے محققین کا خیال ہے کہ ''مدرسہ'' کا لفظ اسلامی تاریخ کے مآخذ میں تقریباً چوتھی صدی ہجری کے آخر سے نظر آتا ہے۔

چنانچہ ابن خلکان رحمہ اللہ -متوفی ۶۸۱ھ=۱۲۸۲ء- کی رائے یہ ہے کہ عہد سلجوقی کے وزیر نظام الملک طوسی -متوفی ۴۸۵ھ=۱۰۹۲ء- اسلامی تاریخ کا وہ پہلا شخص ہے جس نے مدارس قائم کیے، اور سب سے پہلے قائم ہونے والا مدرسہ بغداد کا مدرسہ نظامیہ ہے، جس کی تعمیر کا آغاز ۴۵۷ھ=۱۰۶۴ء میں ہوا، اور ذی قعدہ ۴۵۹ھ=۱۰۶۶ء میں اس کا افتتاح ہوا۔

ابن خلکان نے وزیر موصوف کے تذکرے میں لکھا ہے کہ: اس نے مدارس، مساجد اور خانقاہیں بنوائیں، اور وہ پہلا شخص ہے جس نے مدارس قائم کیے، پھر لوگوں نے اس کے طریقے کو اپنانا شروع کیا، اس نے اپنے مدرسے کی (یعنی نظامیہ) کی تعمیر کی ابتدا ۴۵۷ھ میں کی، اور ۴۵۹ھ میں اس کا افتتاح کیا(۱)۔

ابن خلکان کی اس رائے سے حافظ ذہبیؒ -متوفی ۷۴۸ھ = ۱۳۴۷ء- نے بھی اتفاق کیا ہے۔

ان دونوں کے خیال سے دوسرے بہت سے مورخین نے بھی اتفاق کیا ہے، تاج الدین سبکی

(۱)وفیات الأعیان: ۳۹۶/۱، الکامل فی التاریخ: ۱۶۲/۸، البدایة والنهایة: ۱۴۰/۱۲، حسن المحاضرة: ۱۵۶/۲

انصاریؒ -متوفی ۷۷۱ھ = ۱۳۶۹ء- نے نو (۹) ایسے مدارس شمار کیے ہیں جو نظامیہ کے نام سے معروف تھے۔ یہ: بغداد، بلخ، نیساپور، ہرات، اصفہان، مرو، آمد، طبرستان اور موصل کے مدرسے تھے(۱)۔

ان مدارس کو قائم کرنے والا سلطنت سلجوقیہ کا وزیر نظام الملک، حسن بن علی بن اسحاق بن عباس طوسی تھا، طوس کے نواح میں ۴۰۸ھ = ۱۰۱۷ء میں پیدا ہوا تھا، اس کے والد نے اس کو قرآن کریم حفظ کرایا، اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کے مطابق فقہ کی تعلیم دلائی، پھر سلطان الپ ارسلان سلجوقی کے دربار سے وابستہ ہوکر اس کی خدمت پر مامور ہوا، الپ ارسلان کے بعد اس کے لڑکے ملک شاہ سلجوقی کے عہد سلطنت میں کاروبار مملکت کا مدبر بن گیا، ملک شاہ کے ساتھ وہ کئی بار بغداد بھی آیا، اور خلیفۂ وقت کی طرف سے اس کے ساتھ عزت واحترام کا معاملہ کیا گیا، ملک شاہ کے ساتھ ملک روم کے غزوات میں بھی شریک ہوا، اور حلب و دیار بکر وغیرہ متعدد علاقوں پر فتوحات کے پرچم لہرائے، پھر خراسان اور ماوراء النہر وغیرہ کی طرف واپس لوٹ گیا، اور ۴۸۵ھ میں سفر آخرت پر روانہ ہوگیا(۲)۔

نظام الملک ایک دیندار اور متواضع انسان تھا، اذان کی آواز سنتے ہی ہر کام چھوڑ دیتا اور نماز کے لیے تیار ہوجاتا، اوقات نماز کا اس کو بہت خیال رہتا، اور کہیں بھی رہتا قرآن کریم اپنے ساتھ رکھتا۔

ہمیشہ باوضو رہتا، اور جب وضو کرتا تو وضو کی نفل ادا کرتا، بردبار اور باوقار تھا، اس کے اخلاق میں سب سے عمدہ اور پسندیدہ چیز علماء نوازی تھی، اس کی مجلس فقہا اور دین داروں سے معمور رہا کرتی تھی (۳)۔

ابوالوفاء ابن عقیل حنبلی نے اس کی مدح وثنا کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے جود وسخا، بخشش وداد ودہش، شرم وحیاء اور دین کی بقاوسربلندی کے لیے فکرمندی جیسے بلند اخلاق نے لوگوں کی عقلوں کو حیران کردیا تھا، اس نے مدارس قائم کیے، ان کے لیے اوقات مقرر کیے، حج کے راستوں کو کھول کر ان کو آباد کیا، حرمین میں تعمیر کا کام کرایا، کتب خانے بنوائے، اس کے زمانے میں علم وفن کا بازار گرم رہا، علماء کو دنیاداروں پر فوقیت وسربلندی حاصل رہی، عام لوگوں کو اس کے دربار میں عزت دی جاتی، اور

---

(۱) طبقات الشافعیہ: ۳۱۳/۴ (۲) طبقات الشافعیہ (۳) المنتظم: ۶۵/۹

ان کے داخلے پر پابندی نہ ہوتی [(۱)]۔

ابوشامہ مقدسی -متوفی ۶۶۵ھ = ۱۲۶۶ء- نے لکھا ہے: ''اس نے شافعی لوگوں کے لیے مدارس قائم کیے، اوران کے لیے اوقاف مقرر کیے، آگے لکھا ہے کہ: اس کے مدارس دنیا میں مشہور ہیں، ان سے کوئی شہر خالی نہیں تھا، حتی کہ جزیرۂ ابن عمر جوز مین کے ایسے حصے میں واقع ہے، جس کی طرف کسی کی توجہ نہیں ہوتی، اس میں بھی اس نے ایک بڑا اور اچھا مدرسہ تعمیر کیا تھا'' [(۲)]۔

اور کہا جاتا ہے کہ عراق وخراسان کے ہر شہر میں نظام الملک کا بنایا ہوا مدرسہ تھا، اس نے نیشاپور میں ایک شفاخانہ اور بغداد میں ایک خانقاہ بھی تعمیر کرائی تھی [(۳)]۔

یہ سب مدارس نظامیہ مسجدوں سے علاحدہ ہٹ کر تعمیر کیے گئے تھے، بلکہ ان مدارس کے اندر مسجدیں تھیں، جن میں مذہبی فرائض ادا کیے جاتے تھے۔ ان مدارس کے اخراجات اوران کی عمارتوں اور کتب خانوں پر خرچ کے لیے اوقاف مقرر کیے گئے، ان اوقاف کی آمدنی سے ان مدارس کے مدرسین، اصحاب درس وافادہ، ائمہ وموذنین، خدمت گزاروں اور دوسرے ضرورت مندوں کا خرچ پورا کیا جاتا تھا۔

خاص طور سے بغداد کا مدرسہ نظامیہ بہت عظیم الشان تھا، دجلہ کے کنارے واقع تھا، اوراس کے اردگرد بازار، جاگیریں، دوکانیں اور حمام بنائے اور تعمیر کیے گئے تھے، اس مدرسے کا خرچ ساٹھ ہزار دینار کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس مدرسے کی دور دور شہرت تھی، حتی کہ تاریخ، ادب، فقہ، حدیث، تذکرہ اور جغرافیہ وشہروں کی تاریخ کی کوئی کتاب اس کے ذکر، اس کے واقعات، اس کے مدرسین، اصحاب منصب وارباب افتاء، اس کے کتب خانے کے نگراں اوراس کے اوقاف کے منتظمین کے ذکر سے خالی نہیں۔ اوراس کا سبب یہی ہے کہ پانچویں صدی ہجری وگیارہویں صدی عیسوی کے مدارس اسلامیہ میں یہ مدرسہ شہرۂ آفاق تھا۔

اس مدرسے سے ایسے بڑے بڑے اہل علم فارغ التحصیل ہوئے، جو آفاقی شہرت کے حامل ہیں، اور جو آگے چل ممالک اسلامیہ میں تحریک مدارس کو فروغ دینے میں بھرپور کردار ادا کیا۔

(۱) طبقات الشافعیۃ ۳۱۸/۴ (۲) کتاب الروضتین ۶۲/۱-۶۳
(۳) طبقات ۳۱۴/۴

بغداد کے اس مدرسہ کے شروع کے اساتذہ میں: شیخ ابواسحاق شیرازی -متوفی ۴۷۶ھ-، امام ابونصر صباغ -متوفی ۴۷۷ھ-، خطیب تبریزی -متوفی ۵۰۲ھ-، امام ابوحامد غزالی -متوفی ۵۰۵ھ-، ابوعبداللہ طبری جو امام الحرمین کے لقب سے معروف تھے (مگر امام الحرمین عبدالملک جوینی -متوفی ۴۹۵- کے علاوہ تھے) عبدالرحمٰن بن حسین بن محمد طبری -متوفی ۵۳۰ھ-، محی الدین بن یحیی نیساپوری -متوفی ۵۴۸ھ-، ابوالبرکات انباری نحوی -متوفی ۵۷۷ھ- ابن فضلان ابوالقاسم -متوفی ۵۹۵ھ-، ابوبکر دہان -متوفی ۶۲۱ھ- اور شرف الدین جوینی جیسے اساطین علم وفن تھے[1]۔

قزوینی، خطیب بغدادی، ابن خلکان اور ابن الوردی کے بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے خیال میں نظام الملک طوسی وہ پہلا شخص ہے جس کے ذریعے مدرسوں کا قیام عمل میں آیا[2]۔

اس کے برعکس سبکی، قزوینی اور ان دونوں کی پیروی میں امام سیوطی -رحمہ اللہ- نے اس خیال کی تردید کی ہے، اور اس بات پر زور صرف کیا ہے کہ پانچویں صدی ہجری -جس میں نظام الملک گزرا ہے- سے پہلے مدارس موجود تھے۔

طبقات الشافعیہ میں سبکی نے نظام الملک کے تذکرے میں اپنے استاد حافظ ذہبی کا ان الفاظ میں رد کیا ہے: ''ہمارے شیخ ذہبی کا خیال ہے کہ نظام الملک پہلا شخص ہے، جس نے مدرسہ قائم کیا، حالانکہ ایسا نہیں ہے''۔ سبکی نے اپنی بات کی تائید میں آگے لکھا ہے کہ: ''نظام الملک کی پیدائش سے پہلے نیشاپور میں مدرسہ بیہقیہ موجود تھا، نیشاپور ہی میں مدرسہ سعدیہ بھی تھا، جس کو سلطان محمود کے بھائی امیر نصر بن سبکتگین نے اس وقت تعمیر کرایا تھا، جب وہ وہاں کا حاکم تھا۔ نیشاپور میں ایک اور مدرسہ بھی تھا، جس کو ابواسماعیل بن علی مثنی استرآبادی (خطیب بغدادی کے استاد) نے قائم کیا تھا، وہاں ایک چوتھا مدرسہ بھی تھا جو ابواسحاق اسفرائینی کے لیے بنوایا گیا تھا''[3]۔

المستدرک کے مصنف حاکم نیشاپوری نے جہاں یہ لکھا ہے کہ شیخ خراسان ابواسحاق نیشاپوری کے لیے چوتھی صدی ہجری میں ایک مدرسہ قائم کیا گیا، وہیں یہ بھی لکھا ہے کہ ''اس سے پہلے

---

(۱) علماء النظاميات ومدارس المشرق الاسلامي، از: معروف نامی، صفحہ ۱۹ تا ۴۰

(۲) آثار البلاد وأخبار العباد للقزويني: ۴۱۲، تتمة المختصر في أخبار البشر لابن الوردي ۱۴/۲، تاریخ ابن خلکان ۱۱۹/۲

(۳) طبقات الشافعیہ: ۳۱۴/۴

اس جیسا مدرسہ نہیں تعمیر کیا گیا، چنانچہ انھوں نے اس میں درس کا حلقہ قائم کیا[۱]۔

مقریزی -متوفی ۸۴۵ھ=۱۴۴۱ء- کی رائے یہ ہے کہ نظام الملک کے قائم کیے ہوئے مدرسے قدیم مدارس میں مشہورتر تو تھے، لیکن یہ سب سے پہلے قائم ہونے والے مدرسے نہیں تھے۔ اس نے مدارس کے آغاز کے بارے میں بہت صراحت سے لکھا ہے کہ ان کا رواج ہجری تقویم کے اعتبار سے ۴ صدیوں کے بعد ہوا، اور سب سے پہلے جس مدرسے کی تعمیر کا ذکر ملتا ہے وہ نیشاپور والوں کا مدرسہ ہے[۲]۔

ان تاریخی بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی صدی اور پانچویں صدی ہجری کے اوائل میں بھی مدارس تھے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نظام الملک طوسی اس قسم کا سب سے پہلا مدرسہ قائم کرنے والا نہیں تھا۔

مقدسی -متوفی ۳۷۸ھ- نے اپنی کتاب ''أحسن التقاسیم''میں، جس کو اس نے ۳۷۵ھ= ۹۸۵ء میں تصنیف کیا ہے، لکھا ہے کہ: ''میں نے مساجد میں قیام کیا، جامع مسجدوں میں مذاکرہ کیا، اور مدارس کا چکر لگایا''[۳]۔ پھر خطۂ مشرق کے بارے میں اس نے لکھا ہے کہ ''وہ علم کا گہوارہ ہے، اس میں علماء کی کثرت ہے، اس میں فقہاء بادشاہوں کے ہم رتبہ ہیں، اس خطے کے صرف ہیطل کے ایک علاقے میں سمرقند جیسا عظیم الشان اور خجندہ جیسا عجیب وغریب شہر آباد ہے، یہ خطہ مدارس اور ائمہ ومشائخ کا مرکز ہے۔ . . اس میں شب وروز درس کے زمزمے گونجتے ہیں''[۴]۔

اسی وجہ سے کچھ مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں سب سے پہلے نیشاپور میں مدارس قائم ہوئے، یہ چوتھی صدی ہجری کی بات ہے، جب مدرسہ کی مستقل عمارت کا رواج ہوا، اور اپنے اصطلاحی نام سے معروف ہوا، اور درس وتدریس کے لیے مخصوص ادارے کی حیثیت سے شہرت پذیر ہوا، اور اس کا سبب یہ قرار دیتے ہیں کہ شہر نیشاپور اہل سنت اور بالخصوص شافعیہ کا ایک اہم مرکز تھا، اور محدثین کی ایک بڑی جماعت وہاں پیدا ہوئی تھی، جیسے ''شعب الایمان'' کے مصنف شافعی فقیہ امام بیہقی -متوفی ۴۵۴ھ=۱۰۶۳ء-، تاریخ نیساپور کے مصنف اور قابل اعتماد مؤرخ حاکم نیساپوری

---

(۱) شذرات الذہب: ۲۰۹/۳ (۲) خطط المقریزی: ۳۶۳/۲

(۳) أحسن التقاسیم (۴) ایضاً: ۳۹۰

-متوفی ۴۰۶ھ = ۱۰۱۵ء- وغیرہ۔

مراجع کی کتابوں میں مذکور بعض تحریروں اور تاریخی بیانات کے تجزیہ اور ان کے درمیان موازنہ سے ایسے معلومات حاصل ہوتے ہیں جو مدارس نظامیہ سے پہلے اسلامی ممالک میں مدارس کے وجود کی نشان دہی کرتے ہیں، ذیل میں ان میں سے چند ایک کا ذکر بطور مثال کے- بطور حصر کے نہیں- کیا جاتا ہے:

۱- ۳۴۵ھ میں مشہور محدث وادیب امام ابوحاتم بستی تمیمی -متوفی ۳۵۴ھ = ۹۶۵ء- نے اپنے شہر ''بست'' میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا، اس میں ایک کتب خانہ اور طلبہ کے لیے رہائشی کمرے بھی تعمیر کرائے تھے، اور غریب ونادار طلبہ کے لیے کچھ رقم اور روزینے مخصوص کیے تھے، کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اس ادارے میں اپنی تمام تصانیف جمع کردی تھیں، اور لوگوں کے مطالعہ کے لیے ان کو وقف کردیا تھا[(۱)]۔

۲- ۳۴۹ھ سے پہلے ابوالولید حسان بن محمد قرشی -متوفی ۳۴۹ھ- کا مدرسہ قائم ہوا، حاکم ضبّی کا بیان ہے کہ: ''وہ -ابوالولید- خراسان کے محدثین کے امام تھے، اور جن اہل علم کو میں نے دیکھا ہے، ان میں سب سے زیادہ زاہد، عبادت گزار، سادگی پسند اور اپنے مدرسہ اور گھر تک محدود رہنے والے تھے''[(۲)]۔

۳- ۳۴۹ھ میں امام وحافظ ابوعلی حسین بن علی نیشاپوری -متوفی ۳۴۹ھ- کے شیدائی شافعیوں نے نیشاپور میں خاص ان کے واسطے ایک مدرسہ تعمیر کیا[(۳)]۔

۴- ۳۶۱ھ میں فقیہ ابوحفص بخاری کا مدرسہ قائم کیا گیا تھا، جس میں ابن شاہویہ نے ۳۶۱ھ میں درس دیا تھا[(۴)]۔

۵- ۳۶۲ھ میں طہران کے فضلا نے امام حاتمی -متوفی ۳۶۲ھ- کے واسطے ایک مدرسہ قائم کیا تھا، جس میں وہ شافعی مذہب کی تعلیم دیا کرتے تھے[(۵)]۔

---

(۱) معجم الادباء: ۴۱۸/۱

(۲) طبقات الشافعیہ: ۲۲۹/۳، بدایہ ونہایہ: ۲۳۶/۱۱، تذکرۃ الحفاظ: ۱۰۴/۳، شذرات: ۳۸۰/۲

(۳) معجم الادباء: ۴۱۹/۱ (۴) مدارس ما قبل النظامية، از: معروف ناجی: ۶۶

(۵) التربية والتعليم في الإسلام، از: محمد اسعد: ۱۲۳

۶-۳۸۸ھ سے پہلے محمد بن عبداللہ حمشادی نیشاپوری -متوفی ۳۸۸ھ- کا مدرسہ تعمیر ہوا تھا، ان کی نسبت سبکی نے لکھا ہے کہ: ''دنیا سے رخصت ہونے تک ان کی زندگی صرف ان کی مسجد اور مدرسے تک محدود رہی''(۱)۔

۷-۳۹۱ھ میں دمشق کے مدرسہ صادریہ کا قیام ہوا، جس کو امیر شجاع الدولہ صادر بن عبداللہ -متوفی ۳۹۱ھ = ۱۰۰۰ء- نے دمشق میں قائم کیا تھا، اس مدرسے کا سراغ ہمدانی -متوفی ۳۹۸ھ = ۱۰۰۷ء- کے رسائل میں ملتا ہے(۲)۔

۸-۳۹۳ھ میں ابوعلی حسینی -متوفی ۳۹۳ھ- نے علم حدیث کی تعلیم وتدریس کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا تھا، جس کے طلبہ کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ گئی تھی، جو ملک کے گوشے گوشے سے اس میں تعلیم کے لیے آتے تھے(۳)۔

۹-۴۰۲ھ سے پہلے نیشاپور میں مدرسہ صاعدیہ قائم ہوا، اور کہا جاتا ہے کہ ۴۰۲ھ میں سہل صعلوکی عجلی کا مدرسہ قائم کیا گیا، یہ ابوطیب بن ابی سہل صعلوکی ہیں، اور وہ بنی حنیفہ کی شاخ عجل سے تعلق رکھتے ہیں، ۴۰۴ھ میں نیشاپور میں وفات پائی، نیشاپور کے مفتی تھے، شمس الاسلام ان کا لقب تھا، متعدد اہل علم سے تحصیل علم کی تھی، ان سے حاکم ضبی اور ابوبکر بیہقی جیسے نیشاپور کے فقہاء نے حدیث روایت کی تھی، درس وافتاء کا مشغلہ رکھتے تھے(۴)۔

۱۰- ۴۰۵ھ سے پہلے علامہ صابونی کا مدرسہ قائم ہوا تھا، ان کو خراسان کے لوگ ''شیخ الاسلام'' کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے، طبقات الشافعیہ میں شیخ الاسلام ابوعثمان صابونی -متوفی ۴۴۹ھ- کا مفصل تذکرہ ہے(۵)۔

۱۱-ابن خلکان کے بیان کے مطابق ۴۰۶ھ میں نیشاپور کے علماء نے مشہور محدث وادیب اور واعظ ابوبکر بن فورک کو دعوت دے کر بلایا، تاکہ وہ اس مدرسے میں درس ووعظ کی مجلس قائم کریں جس کو ان لوگوں نے خاص طور سے ان ہی کے واسطے تعمیر کیا تھا، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس مدرسے کو ناصر الدولہ ابوالحسن محمد بن ابراہیم نے بنوایا تھا، اور علامہ سبکی نے محمد بن حسن بن فورک انصاری -متوفی

(۱)طبقات:۱۶۲/۳ (۲)نشأة المدارس المستقلة في الإسلام:۹
(۳)التربية والتعليم في الإسلام:۱۲۴ (۴)طبقات:۳۹۳/۴، بدایہ:۳۲۴/۱۱، شذرات:۱۷۲/۳
(۵)وفیات الاعیان:۲۷۲/۴

۴۰۶ھ- کے تذکرے میں ابوعبداللہ حاکم سے نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں: ''ہم ناصر الدولۃ ابوالحسن محمد ابن ابراہیم کے پاس حاضر ہوئے، اور ان سے ابن فورک کو نیشاپور بلانے کے لیے درخواست کی، تو ناصرالدولۃ نے ان کے واسطے مدرسہ اور مکان تعمیر کرایا، اور ان کی برکت سے خدائے تعالیٰ نے ہمارے شہر میں مختلف قسم کے علوم زندہ کر دیے۔''(۱) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن فورک کا یہ مدرسہ ۴۰۶ھ سے پیشتر تعمیر ہوا تھا۔

اسی طرح ان لوگوں نے امام ابواسحاق اسفرائینی -متوفی ۴۱۸ھ- اور شافعی فقیہ ابراہیم بن محمد بن ابراہیم -متوفی ۴۱۱ھ- کو ایک دوسرے بڑے مدرسہ میں درس تدریس کے لیے دعوت دے کر بلایا تھا، جس کو نیشاپور کے اہل علم نے تعمیر کرایا تھا(۲)۔

۱۲- ۴۲۹ھ سے پہلے وہ مدرسہ قائم کیا گیا جس کو ایک بڑے شافعی عالم ابوبکر بُستی -متوفی ۴۲۹ھ- نے نیشاپور کے اہل علم کے لیے اپنے گھر کے دروازے پر تعمیر کیا تھا، اور اس مدرسے کے لیے اپنا بہت سا مال وقف کر دیا تھا۔ ابوبکر بُستی نیشاپور کے بڑے مدرسین اور مناظرین میں سے تھے(۳)۔

نیشاپور ہی میں ایک مدرسہ ابوسعید اسماعیل بن علی بن مثنی استرآبادی -متوفی ۴۴۸ھ- نے بھی قائم کیا تھا۔ خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ استرآبادی بہت پہلے نیشاپور وارد ہوئے تھے، اور شافعی مذہب کے لوگوں کے لیے وہاں ایک مدرسہ تعمیر کیا تھا(۴)۔

۱۳- ۴۳۷ھ کے متعلق ناصر خسرو سیاح نے لکھا ہے کہ اس نے اپلے کے بازار کے قریب مزدوروں کو ایک مدرسہ بناتے ہوئے دیکھا ہے، جس کی تعمیر کا حکم سلجوقی بادشاہ طغرل بیگ نے دیا تھا۔ ناصر خسرو نے اس کا مشاہدہ نیشاپور کے سفر کے دوران شوال ۴۳۷ھ اپریل ۱۰۴۶ء میں کیا تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ: ''میں ۱۱؍شوال ۴۳۷ھ کو نیشاپور میں داخل ہوا، اس وقت جفری بیگ کا بھائی طغرل بیگ حاکم تھا، لوگ طغرل بیگ کے حکم سے اپلوں کے بازار کے قریب ایک مدرسہ تعمیر کر رہے تھے''(۵)۔

۱۴- ۴۵۰ھ میں نیشاپور کے محلۂ سیار میں مدرسۂ بیہقیہ قائم کیا گیا، اس کو شافعی عالم امام ابوالحسن محمد بن شعیب بیہقی -متوفی ۴۵۸ھ- نے قائم کیا تھا، یہ اصلاً خسرو کے رہنے والے تھے، بہت

---

(۱) طبقات الشافعیہ: ۵۲/۳، اعلام: ۸۳/۶ (۲) وفیات الاعیان: ۲۸/۱
(۳) طبقات: ۸۰/۴ (۴) تاریخ بغداد: ۳۱۵/۶، طبقات: ۲۹۳/۴، شذرات: ۲۷۳/۳
(۵) سفرنامہ ناصر خسرو: ۲۲

سی مشہور کتابوں کے مصنف تھے۔

لوگ اس مدرسہ کو محلۂ سیار کا مدرسہ کہا کرتے تھے، خود امام ابوالحسن بیہقی نے اس میں ایک مدت تک درس وتدریس کی خدمت انجام دی تھی، انھوں نے اس مدرسے میں اپنے طلبہ کے اوقات کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا، ایک حصہ تدریس کے لیے، دوسرا حصہ لکھوانے کے لیے، اور ایک حصہ عام مسلمانوں کے وعظ ونصیحت کے لیے۔

اس مدرسہ کو حدیث شریف کے علم میں اختصاص حاصل تھا، اور اس پر ایک بہت بڑا کتب خانہ بھی وقف کیا گیا تھا(۱)۔

احمد بن عبدالملک نیشاپوری مؤذن - متوفی ۴۷۰ھ - کے بارے میں مذکور ہے کہ وہ مدرسہ بیہقیہ کے مینار پر حسبۃً للہ اذان دیا کرتے تھے(۲)۔

حافظ ذہبی نے احمد بن عبدالملک کے بارے میں لکھا ہے کہ: ''وقف کی بہت سی کتابیں اور حدیث کے اجزاء ان کی نگرانی میں تھے، جن کی وہ نگہداشت کیا کرتے تھے''(۳)۔

۱۵- پانچویں صدی ہجری کے نصف اول میں سلطان محمود غزنوی کے بھائی نصر بن سبکتگین نے مدرسہ سعدیہ قائم کیا، جس کی نسبت مقریزی نے لکھا ہے: ''اسلامی تاریخ میں سب سے پہلے جن کے بارے میں مدرسہ قائم کرنا بتلایا جاتا ہے وہ اہل نیشاپور ہیں......... جہاں امیر نصر بن سبکتگین نے بھی ایک مدرسہ قائم کیا تھا''(۴)۔

۱۶- اس طرح ۴۵۹ھ میں ابوسعد ابن المستوفی نے مدرسۃ الامام ابوحنیفہ کی بنیاد رکھی، جس کا ۲۷/ جمادی الاخری ۴۵۹ھ سے پہلے افتتاح عمل میں آیا، جو بغداد کے مدرسہ نظامیہ کے افتتاح سے پانچ مہینے قبل ہوا تھا، مگر یہ ہے کہ مدرسہ نظامیہ کے کام کی ابتدا اس کے افتتاح سے دو سال پہلے ہوئی تھی (۵)۔

(جاری ہے)

---

(۱) معجم البلدان: ۱/۵۳۸، طبقات: ۳/۱۳۷ (۲) طبقات الشافعیہ: ۳/۱۳۷
(۳) سیر اعلام النبلاء: ۱۸/۲۲ (۴) خطط مقریزی: ۴/۱۹۳
(۵) الجامعات الإسلامیۃ الکبری، از: غنیمہ، محمد عبدالرحمٰن: ۹۹